سلسلہ مطبوعات نمبر ۵

"ہوا چراغ ندوہ گل ہوا، جلیل" (۱۹۹۵ء سال وفات)

"فروغ احمد عابد" (۱۴۱۶ھ سال وفات)

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی ؒ

حیات و خدمات، اوصاف و کمالات

مرتبہ

محمد عبدالرشید ندوی (ریاض)

ناشر

کمپیوٹر اردو کتابت سنٹر

ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ

سلسلہ مطبوعات نمبر ۵

"ہوا چراغ ندوہ گل ہوا، جلیل" (۱۹۹۵ء سال وفات)

"فروغ احمد عابد" (۱۴۱۶ھ سال وفات)

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حیات وخدمات، اوصاف وکمالات

مرتبہ

محمد عبدالرشید ندوی (ریاض)

ناشر

کمپیوٹر اردو کتابت سنٹر

ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ-۷

قیمت : ۶۰ روپئے

پاریکھ آفسیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

فہرست

۱۔ پیش لفظ .... محمد عبدالرشید ندوی ۴
۲۔ مقدمہ .... مولانا محمد رابع حسنی ندوی ۱۰
۳۔ حیات وخدمات ایک نظر میں .... حافظ عبیدالرحمن ندوی ۱۳
۴۔ تیری سعی و جستجو کو بھولے گا ندوہ کہاں .... اشہر بستوی ندوی ۱۶
۵۔ غم جدائی کا مجھے جینے نہ دے گا اے عزیز .... ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز ۱۸
۶۔ اب آج جلوہ بار وہ تنویر نہیں ہے .... قاری ہدایت اللہ صدیقی ۲۰
۷۔ جانے والے تجھے میرا ڈھیروں سلام .... عذراء خاتون (ریاض) ۲۲
۸۔ ہوا، چراغ ندوہ گل ہوا، جلیل .... محمد عبدالرشید ندوی ۲۴
۹۔ زمین کھاگئ آسماں کیسے کیسے .... عذراء خاتون (ریاض) ۶۸
۱۰۔ پھوپھا! ایک سایہ دار درخت .... صفیہ خاتون (ریاض) ۷۶
۱۱۔ ایک حادثہ جانکاہ .... حافظ عبدالجلیل حسینی ندوی ۸۰
۱۲۔ آہ! والد گرامی .... محمد عبدالحی ثانی ۸۳
۱۳۔ ماموں صاحب .... شمیم احمد فاروقی (کراچی) ۹۱
۱۴۔ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ ...... مولانا محمد رابع حسنی ندوی ۹۵
۱۵۔ تاثرات ومشاہدات .... مولانا برہان الدین سنبھلی ۱۰۰
۱۶۔ مولانا محمد عبدالسمیع ندویؒ .... پروفیسر وصی احمد صدیقی ۱۰۲
۱۷۔ کچھ یادیں کچھ باتیں .... مولانا شفیق الرحمن ندوی ۱۰۷
۱۸۔ احساسات وتاثرات ومشاہدات ...... ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی ۱۱۲

۱۹ ۔ موت العالم موت العالم .... چودھری وہاج احمد اشرف ۱۱۴
۲۰ ۔ آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے ..... مولانا حسب اللہ ندوی ۱۱۹
۲۱ ۔ وہ کیا گردوں ہے تو .... مکین اشرف صدیقی ۱۲۶
۲۲ ۔ ایک مربی و محسن .... محمد عرفان سلطانپوری ۱۳۲
۲۳ ۔ ندوہ کی مسجد میں پہلی تعزیتی تقریر .... مولانا خالد ندوی غازیپوری ... ۱۳۶
۲۴ ۔ ندوہ کی مسجد میں دوسری تعزیتی تقریر ..... مولانا برہان الدین سنبھلی ... ۱۴۰
۲۵ ۔ مولانا عبدالسمیع صاحب ندویؒ .... طلحہ بن ابو سلمہ ندوی ۱۴۵
۲۶ ۔ شجرہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ..... محمد عبدالرحمٰن حسینی ۱۴۷
۲۷ ۔ شجرہ اہلیہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ. محمد عبدالرحمٰن حسینی ۱۵۴
۲۸ ۔ تاریخی امانتیں .... محمد عبدالرشید ندوی ۱۵۷

پیش لفظ

غم جدائی کا مجھے جینے نہ دے گا اے عزیز
بیقراری ہم نے پائی ہے، وہ جنت پا گئے

لیجئے حسب وعدہ والد گرامی جناب مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وواقعات، اوصاف وکمالات اور ان کی خدمات پر مشتمل کتاب حاضر ہے، کتاب کا پیش لفظ لکھنے بیٹھا ہوں تو وہ زخم جو ابھی تک بھرے نہ تھے پھر سے ہرے ہوگئے ہیں، آنکھیں اشکبار ہوگئیں ہیں اور جذبات واحساسات کو زبان مل گئی ہے تو یہ چند لفظ قلم برداشتہ حاضر خدمت ہیں، رنج وغم کے اظہار کے لئے نہ تو قلم ہی ساتھ دینے کے لے تیار ہے اور نہ زبان ہی میں قوت گویائی ہے، ہم لوگوں نے کیا کھودیا؟ آپ کو کیسے اور کیونکر بتائیں؟

سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک دل ودماغ اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ والد صاحب کا انتقال ہوچکا ہے، میں تو جب بھی لکھنؤ جاتا ہوں میرے لئے ہر بار یہ حادثہ نیا ہوجاتا ہے کیونکہ یہاں (ریاض میں) تو میں ان کے بغیر رہنے کا عادی ہوں اس لئے ان کی کمی کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جب جب میں ریاض سے ندوہ (لکھنؤ) جاتاہوں ہر ہر بار ان کا غم تازہ ہوجاتا ہے، ہر ہر جگہ ان کی یاد آتی ہے، ہر ہر قدم ان کی کمی محسوس ہوتی ہے، خواہ وہ گھر ہو یا مسجد، دفتر ہو یا نظامت، شعبہ ہو یا مکتبہ، بے قرار نگاہیں ہر جگہ ان کو تلاش کرتی ہیں، اور کان ہر گوشہ سے ان کی آواز سننے کو بیتاب

رہتے ہیں لیکن وہ چہرہ کہیں نہیں دکھائی دیتا جو باعث تسکین قلب وجان ہے، اور وہ آواز کہیں نہیں سنائی دیتی جو وجہ انبساط روح ہے، بس اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو صبر وسکون عطا فرمائے۔ (آمین)

عام طور پر لوگ جب اپنی کسی محبوب شخصیت کی سوانح نگاری کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو تعریف وتوصیف کے جتنے بھی کلمات ہوسکتے ہیں اور تعبیرات وتشبیہات کے جتنے بھی جملے ملتے ہیں اور اسلوب وبیان کے جتنے بھی صیغے ہوسکتے ہیں وہ سب موصوف کی مدح سرائی میں استعمال کرلیتے ہیں، خواہ یہ سارے کلمات اور جملے ان پر صادق آتے ہوں یا نہ آتے ہوں، اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح گویا انھوں نے صاحب سوانح کا حق ادا کردیا، حالانکہ اس سے صاحب سوانح کی سچی اور حقیقی تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی، بلکہ وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت معلوم ہوتی ہے اور یہ بات واقعہ کے بھی خلاف ہوتی ہے اور امانت ودیانت کے بھی خلاف ہوتی ہے۔

اسی لئے میں نے اپنے مضمون میں مبالغہ آرائی اور بیجا تعریف سے گریز کیا ہے، صرف واقعات اور حقائق ہی پیش کئے ہیں، کیونکہ میرے نزدیک ان کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ جتنے بڑے تھے اتنے ہی بڑے نظر آئیں، نہ اپنے قد سے چھوٹے نظر آئیں اور نہ اپنے قد سے بڑے نظر آئیں، تاکہ جن لوگوں کا ان سے سابقہ اور واسطہ پڑا ہے، جن لوگوں نے ان کو دیکھا بھالا ہے، وہ بھی پڑھ کر ان کو پہچان سکیں، ان کو اجنبی اور بیگانہ نہ سمجھیں۔

اس کتاب میں شامل تمام مضامین میں سب سے زیادہ طویل مضمون میرا ہی ہے، میرے مضمون کا ابتدائی حصہ تاثراتی اور جذباتی ہے، اگراس میں آپ کو کچھ مبالغہ اور جذباتیت محسوس ہو تو اس کے لئے مجھے معذور سمجھیں، کیونکہ جہاں جذبات کا عمل دخل ہو وہاں بقول علامہ اقبال عقل کو تھوڑی دیر کے لئے تنہا بھی چھوڑ دینا چاہئے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

البتہ سوانحی حصہ میں میں نے عقل کو جذبات پر غالب و حکمراں ہی رکھا ہے اور کسی جذباتیت یا مبالغہ آرائی سے گریز کیا ہے، جو کچھ بھی لکھا ہے یا تو میرا دید ہے، یا ذاتی طور پر اور والد صاحب سے شنید ہے، یا ان کا ماخذ والد صاحب اور دیگر لوگوں کے خطوط یا قلمی اور مطبوعہ تحریریں ہیں، یہ وضاحت میں اس لئے بھی کر رہا ہوں کہ بعض حضرات نے میرے اس مضمون کو جو "تعمیر حیات" میں نہیں شائع ہو سکا، اور "بانگ درا" کی تین اشاعتوں (اپریل تا جون ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا مبالغہ آرائی یا جھوٹ پر محمول کیا، اور ایک صاحب نے مجھ سے طنزاً کہا بھی "لگتا ہے تمہارے والد ندوہ کا سارا کام کرتے تھے"! اور "کیا تم چاہتے ہو تمہارے والد پر کتاب لکھی جائے"

میں "بانگ درا" میں اپنے مضمون کی اشاعت کے لئے مولانا سلمان الحسینی ندوی صاحب اور امین الدین شجاع الدین صاحب کا مشکور ہوں، وہی مضمون اب مزید اضافوں کے ساتھ اس کتاب کی زینت ہے۔

اس کتاب میں شامل دیگر مضامین کے لئے میں تمام مضمون نگار حضرات کا ممنون ہوں، ان میں سے ہر مضمون میں آپ کو والد صاحب کے بارے میں کوئی نہ کوئی نئی بات یا ان کی کوئی نئی خصوصیت معلوم ہوگی مثلاً:

استاد محترم جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کے مضمون سے والد صاحب سے ان کے اور ان کے خاندان کے قدیمی اور خصوصی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے، ساتھ ہی اس زمانہ میں "شبلی بکڈپو" کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے جسے والد صاحب نے خرید لیا تھا "شبلی بکڈپو" سے دستبردار ہونے کے بعد ہی والد صاحب ندوہ سے منسلک ہوئے تھے۔

استاد گرامی جناب مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی نے ان کی سنجیدگی،

کم گوئی، عدم یاوہ گوئی، نیچی نگاہ، گرمی، سردی، برسات تینوں موسموں میں نماز باجماعت کے التزام کا تذکرہ کیا ہے، مولانا ہی نے سب سے پہلے یہ انکشاف کیا کہ والد صاحب کا نماز میں قراء ت کرنے کا انداز اور لب ولہجہ ہو بہو قاری طیب صاحب مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) جیسا تھا حتی کے بعض لوگوں کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ قاری صاحب نماز پڑھا رہے ہیں یا کوئی دوسرا شخص نماز پڑھا رہا ہے، والد صاحب کے پیچھے پہلی بار نماز پڑھتے ہوئے وہ خود بھی یہی سمجھے تھے کہ قاری طیب صاحب نماز پڑھا رہے ہیں۔

پروفیسر محمد وصی صدیقی صاحب کا یہ جملہ قابل غور ہے "یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ندوہ میں جہاں بھی عقدہ مشکل کی کشود کی ضرورت ہوتی تھی لوگ مولانا کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تھے، میرے کمرے کے دروازے اور کھڑکی سے وہ نظر آتے تھے اور لگتا تھا کہ سرسید کرسی پر فروکش ہیں"

مولانا شفیق الرحمان صاحب ندوی نے اپنے مضمون میں ان کی باوقار اور پرکشش شخصیت میں انتظامی صلاحیت، نظر کی بلندی، فکر کی وسعت، اور سیرت کی پاکیزگی کا انکشاف کیا ہے، ساتھ ہی طلباء کی ذہنی وفکری اور جسمانی تربیت کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالی ہے، طلباء کے ساتھ ان کی شفقت ومحبت، اور ان کی عزت نفس کی حفاظت کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ہارون رشید صاحب صدیقی نے دفتری فرائض کے سلسلہ میں ان کی مستعدی، ضرورت پر فوری توجہ، خدمتِ خلق، اشاعتِ اسلام کا جذبہ، تبلیغِ اسلام کی فکر اور علم طب سے ان کی واقفیت کا تذکرہ کیا ہے ساتھ ہی ان کی دو اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، ملاحظہ ہو "بعض لوگ نوافل کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں لیکن جو ذمہ داری اجرت پر قبول فرماتے ہیں اس میں کوتاہی کرتے ہیں یہ بات بڑے ہی عیب کی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مولانا میں اس قسم کی کوتاہیاں نہ تھیں، وہ اپنی ذمہ داریاں کماحقہ پوری فرماتے، ساتھ میں

نوافل و تطوعات بھی اپنائے رہتے" نیز "ندوہ کے طویل قیام میں کسی پڑوسی یا ساتھ میں کام کرنے والے یا ماتحتی میں کام کرنے والے کسی ایک شخص سے بھی کبھی معمولی شکایت بھی نہ سنی، اور یہ بڑی بات ہے"

چودھری وہاج احمد اشرف نے ان کی بارعب اور پروقار شخصیت کا تعارف کرایا ہے، اور بتایا ہے کہ "رعب" بھی اللہ تعالی کا ایک فضل ہے جس سے وہ اپنے بعض بندوں کو نوازتا ہے، مولانا بھی ان میں سے ایک تھے۔

مولانا حسب اللہ ندوی صاحب نے والد صاحب کے ندوہ سے ملحق مدارس کے معائنہ اور اور ضروریات کے سلسلہ میں کئے جانے والے آخری سفر کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے، یہ بھی ایک نئی چیز ہے۔

تمام نظموں میں (فنی حیثیت سے قطع نظر) اشہر بستوی ندوی کی نظم "تیری سعی و جستجو کو بھولے گا ندوہ کہاں" سب سے بہترین نظم ہے، اس میں والد صاحب کے جملہ اوصاف و کمالات اور تمام خوبیوں کا ذکر آگیا ہے۔

برادر گرامی جناب ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز صاحب عزیز کی نظم مجموعی اعتبار سے ایک تاثراتی نظم ہے، خاص طور پر ان کا یہ شعر درد سے چور جذبات واحساسات کا ترجمان ہے ؎

غم جدائی کا مجھے جینے نہ دے گا اے عزیز
بیقراری ہم نے پائی ہے، وہ جنت پاگئے

تاریخ وادب میں "خطوط" کی حیثیت واہمیت مسلم ہے، اسی لئے میں نے والد مرحوم کے تحریر کئے ہوئے بعض خطوط کے اہم اقتباسات نیز والد مرحوم کے نام آئے ہوئے بعض خطوط کے اہم اقتباسات "تاریخی امانتیں" کے عنوان کے تحت جمع کردیئے ہیں، ان خطوں میں بہت سی وہ باتیں بھی آگئی ہیں جن کا تذکرہ میرے مضمون میں آیا ہے، خطوط "ادبی و تاریخی امانت" ہوتے ہیں اس خیال کے پیش نظر بھی ان خطوں کا تذکرہ ضروری تھا، بہت

ممکن ہے کہ کل کا مورخ ان خطوط سے بعض تاریخی حقائق کا سراغ لگا سکے، اور بعض قارئین ان خطوط کے مندرجات سے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

آخر میں میں استاذ گرامی جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اپنی مشغولیت کے باوجود کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا ساتھ ہی جناب الحاج سیف اللہ صاحب مہاجر (مدینہ منورہ) کا بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے کتاب کی طباعت واشاعت میں بہت مدد کی اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کو اجر وثواب سے نوازے۔

گردش احوال نے آج دو سال بعد مجھے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ میں والد صاحب پر یہ کتاب پیش کروں، ان کا انتقال آج ہی کے دن ۵ شعبان ۱۴۱۶ھ کو ہوا تھا، ہجری اعتبار سے ان کو ہم سے رخصت ہوئے آج دو سال پورے ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اوران کے درجات بلند فرمائے۔ قارئین حضرات سے والد صاحب کے لئے، ساتھ ہی ان کے چھوٹے بھائی سید محمد عبدالمجید (سابق طالب علم ندوہ) کے لئے بھی دعاء کی درخواست ہے، جنھوں نے والد صاحب کے انتقال کے تقریباً دو ماہ بعد ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ بروز جمعہ حسب خواہش ندوہ ہی میں وفات پائی، اور والد صاحب کے پہلو ہی میں دفن ہوئے۔

اللهم اغفر لهما، وارحمهما وادخلهما فسيح جناتك.

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہم سب کے لئے طاعاتِ الٰہی میں مزید اضافہ اور ترغیب وتشویق کا باعث بنائے اور ان کے اعلیٰ اوصاف وکمالات اور اخلاق حمیدہ کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

محمد عبدالرشید ندوی

قيادة القوات البحرية الملكية السعودية

ادارة المسانده الفنية، پوسٹ بکس ۲۲۴۶۳

الرياض - ۱۱۴۹۵ (سعودی عرب)

۵ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ

مقدمہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یہ کتابچہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے، مولانا نے نصف صدی سے زیادہ مدت دعوت الی الحق اور علم دین کی ترویج میں گزار کر اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف آج سے دس ماہ قبل کوچ کیا اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور ان کو اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائے۔

مولانا مرحوم سے میرا ربط و تعلق طویل عرصہ رہا ہے، میں نے ان کو قریب سے دیکھا اور جانا ہے، وہ ایک داعی دین اور خادم ملت شخصیت مولانا سید محمد عبدالحی کے صاحبزادہ تھے اور ان کی کوششوں کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے والے تھے، مولانا مرحوم کے والد مولانا سید محمد عبدالحی صاحبؒ ایک اصلاحی اور دعوتی تنظیم "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" کانپور کے ناظم عمومی تھے اور انھوں نے اس کے ذریعہ اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کا خاصا کام انجام دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سامراجی حکومت کے زیر سرپرستی اسلام دشمن طاقتوں کو مدد مل رہی تھی اور مسلمانوں کی ثقافت اور مذھب کو مٹانے کی سازش کی جارہی تھی ایسے موقع پر اسلام کو تقویت پہونچانے اور اس کی طرف غیروں کو بلانے کا کام بہت اہمیت رکھتا تھا، مولانا عبدالحی صاحبؒ کی ضعیف العمری میں ان کے لائق فرزند مولانا محمد

عبد السمیع صاحبؒ نے ان کے کام میں ہاتھ بٹایا اور کام کو جاری رکھا، مولانا عبد السمیع صاحب نے ہندوستان کے حالات میں تبدیلی آنے پر اور آزادی ملنے پر کام کی نوعیت میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے تعلیم واشاعتِ علم کے راستہ کو اہمیت دی اور انہوں نے اولاً آزادانہ پھر ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوکر اس کام کو انجام دیا، مولانا کا یہ سارا دور لکھنؤ میں رہ کر کام کرنے کا رہا اور اس طرح میرا ان سے ربط وضبط رہا، اور ندوہ سے وابستہ ہونے پر ہم دونوں ایک ہی جگہ مجتمع ہوئے اور اس طرح قریبی ربط رہا۔

مولانا سے ہمارا ایک طرح سے وطنی تعلق بھی تھا. مولانا کرٹرہ ضلع الہ آباد سے تعلق رکھتے تھے ہمارے خاندان کا بھی قدیمی مستقر کرٹرہ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اوپر خاندانی رشتہ داری بھی رہی ہو پھر مولانا میرے مرحوم بڑے بھائیوں سے طالب علمانہ معاصرت بھی رکھتے تھے جس کا اثر میں نے اپنے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی صاحب مرحوم سے ان کے دوستانہ روابط میں دیکھا۔ مولانا کی پیدائش ۱۹۲۰ء کی تھی انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد عربی ودینی تعلیم اولاً ندوۃ العلماء میں ثانیاً دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی جس کے بعد عملی کاموں کی طرف توجہ کی، پانچویں دہائی کے آغاز سے مولانا کا عملی تعلق ندوۃ العلماء سے ہوگیا تھا اور تقریباً ۱۹۵۸ء میں مولانا نے ندوۃ العلماء کے شعبہ تعمیر وترقی میں معاون ناظر کا عہدہ سنبھالا، اس عہدہ کی ذمہ داریوں میں ندوہ کے تعارفی ثقافتی اور حصول تعاون کے کاموں کی نگرانی وانتظام تھا جو ناظر شعبہ کی معاونت میں انجام دینا ہوتا تھا یہ بڑا انتظامی اور ثقافتی کام تھا اس میں دعوتی پہلو بھی شامل تھا اس طرح مولانا کو ان کے شروع سے اپنائے ہوئے طریقے کے مطابق کام کرنے کا موقع ملتا رہا اور وہ خدمت علم ودین کی ذمہ داری ذوق وشوق اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے رہے، مولانا سے میری برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی بلکہ کاموں کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کا بھی موقع ملتا

تھا، مجھے ان سے دیرینہ تعلق کی بنا پر بے تکلفی بھی حاصل تھی اور ذوق میں ہم آہنگی بھی محسوس ہوتی تھی۔ وہ عرصہ سے بیمار تھے لیکن اپنی بیماری کا اظہار بہت کم کرتے تھے اس لئے ان کے انتقال سے ایک روز قبل تک یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہم لوگوں سے اس قدر جلد جدا ہوجائیں گے۔ چنانچہ ان کے انتقال سے ایک اچانک پیش آجانے والے واقعہ جیسا احساس ہوا اور دین ودعوت دین کا کام کرنے والی جماعت میں ایک مفید اور کار گزار فرد کے نہ رہنے کا خسارہ محسوس ہوا اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزاء عطا فرمائے۔

مولانا مرحوم کے فرزندوں میں سے تین نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی، وہ مولوی عبدالرشید ندوی، مولوی عبدالجلیل ندوی، اور مولوی عبیدالرحمٰن ندوی ہیں، اور تین نے معہد دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیگر تعلیم بھی حاصل کی، ان میں سے دو فرزند عزیزی سید محمد عبدالحی ثانی اور عزیزی سید محمد عبدالرحمٰن نیز مولوی سید عبیدالرحمٰن ندوی ندوۃ العلماء کے شعبوں سے ہی وابستہ ہیں، یہ سب صاحبزادگان اپنے والد مرحوم کے اہل تعلق سے ربط رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے والد ماجد کی خوبیوں کو اپنے میں ڈھالنے اور ان کے اعلیٰ دینی مقاصد کو اپنانے میں برکت عطا فرمائے۔ (آمین)

مولانا مرحوم کے ان لائق فرزندوں نے اپنے والد کے کام ومقام کو برائے استفادہ وقدردانی قلمبند کرکے محفوظ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مجھ سے اس کے لئے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی ہے جو میرے لئے مسرت اور سعادت کی بات تھی لہذا میں نے یہ چند سطریں لکھدیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین)

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی

حیات وخدمات ایک نظر میں

حافظ محمد عبیدالرحمن ندوی

نام : سید محمد عبدالسمیع ندوی

تاریخی نام : فروغ احمد (۱۳۳۹ھ)

تاریخ پیدائش : ۲۱ دسمبر ۱۹۲۰ء

تعلیم :

۱ ۔ مدرسہ دارالارشاد ، قصبہ کوڑا جہان آباد، ضلع فتح پور (ہسوہ)

۲ ۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء : ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۹ء

۳ ۔ دارالعلم دیوبند: ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے دوران انگریزوں سے خلاف " دارالحدیث" میں ایک تقریر کی، سی آئی ڈی آفس میں فائل کھل گئی، یہ فائل ۱۹۴۴ء تک کھلی رہی، پھر فائنل رپورٹ لگ گئی۔

۴ ۔ طب اور ہومیو پیتھک تعلیم مولانا حکیم سید شاہ ابو طاہرؒ سے حاصل کی۔

اہم اساتذہ کے نام :

۱ ۔ مولانا محمد شبلی فقیہؒ

۲ ۔ مولانا حیدر حسن خاںؒ

۳ ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۴ ۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

۵ ۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ

۶۔ مولانا سید فخر الدین مراد آبادیؒ

۷۔ مولانا حکیم سید شاہ ابو طاہرؒ

کلکتہ میں طبابت:

کلکتہ کے مشہور طبیب حکیم سمیع اللہ میکش انصاری کے مطب "دیسی دواخانہ" (واقع بولائی دت اسٹریٹ) میں دو سال ۱۹۵۴ء - ۱۹۵۵ء طبابت کی، آج بھی ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے طبی نسخے کئی کاپیوں میں محفوظ ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں تقرر:

ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں "الجمعیۃ التعاونیۃ" ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں بحیثیت منیجر تقرر ہوا۔

۱۹۵۸ء میں جب "شعبہ تعمیر و ترقی" کا قیام عمل میں آیا تو اس کے نائب ناظر مقرر ہوئے، ساتھ ہی رابطہ عمومی کی خدمت بھی سپرد ہوئی، اور تاحیات اس عہدہ پر برقرار رہے۔

دعوتی و تبلیغی خدمات:

۱۹۷۱ء میں "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور" کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، ۱۹۷۴ء میں جمعیۃ کے ترجمان ماہنامہ "محکمات" کا اجراء کیا اور تا حیات یہ دونوں خدمات انجام دیتے رہے۔

۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیانی عرصہ میں ان کے ہاتھ پر دو ہندو اسلام لائے، ایک بینک ملازم اور دوسرا تاجر تھا، کئی نومسلموں اور نادار طلباء کی سرپرستی کی۔

تالیفات:

۱۔ ترجمہ قران (پارہ عم) مطبوعہ دہلی۔

۲۔ عالم برزخ (ابن قیم الجوزی کی کتاب الروح کے چند ابواب کا خلاصہ، مطبوعہ دار الحسنات سہسوان بدایوں

۳۔ قصبہ کوڑہ تاریخ و شخصیات، مطبوعہ اردو کتابت سنٹر ندوی منزل لکھنؤ
۴۔ بابری مسجد غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں، مطبوعہ جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور
۵۔ دعاء خلیل و نوید مسیحا (سیرت) غیر مطبوعہ۔
۶۔ نزول قرآن (ترجمہ) علامہ شیخ سعدی یاسین (غیر مطبوعہ)۔
۷۔ ترجمہ کتاب " اسباب النزول " مولفہ علامہ واحدی نیشاپوری (سورہ بقرہ) غیر مطبوعہ
۸۔ عربی اردو لغت (نامکمل)۔
۹۔ ترجمہ کتاب " سیر سالاری " (فارسی مخطوطہ) مولفہ شیخ علاء الدین متوفی ۹۷۴ھ (چند ابواب) غیر مطبوعہ (یہ کتاب ہمارے خاندان کے ایک بزرگ "مخدوم قطب الدین سالار بڈھ " متوفی ۹۴۶ھ کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے)۔
۱۰۔ ندوہ میں طالب علمی کے زمانہ میں ایک قلمی ماہنامہ " نقاش " کے نام سے نکالتے تھے اس کا ایک شمارہ " جمعیۃ الاصلاح " میں موجود تھا۔
۱۱۔ سیکڑوں اداریئے، کتابوں پر تبصرے اور مضامین تعمیر حیات، محکمات، البدر، وغیرہ میں شائع ہوئے۔

وفات:

تاریخ وفات ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء مطابق ۵ شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ رات تقریباً ۳۰/ ۱۲ ہجری اعتبار سے ۷۷ سال عمر پائی ان کے تاریخی نام "فروغ احمد" کے اعداد ۱۳۳۹ میں اگر "عابد" کے ۷۷ اعداد شامل کردیئے جائیں تو مجموعی اعداد ۱۴۱۶ ہوجاتے ہیں جو ہجری سال وفات ہے۔
عیسوی سال وفات " ہوا چراغ ندوہ گل ہوا، جلیل " سے برآمد ہوتا ہے۔

تیری سعی و جستجو کو بھولے گا ندوہ کہاں

بر وفات مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

اشہر بستوی ندوی

مرہم دردِ دلاں، اور دستگیرِ ناتواں
بے بسوں کے دست و پا تھے اور غم خوار جہاں
صاحب زھد وورع، روشن جبیں، روشن ضمیر
نفس وشیطاں جس کے عزم و حوصلے کے تھے اسیر
کون سا گوشہ ہے جو خالی ہو مدحت سے تری
ضعف وپیری میں نمازوں کی نہ پابندی گئی
استقامت کو تری پائے نہیں کوہ عظیم
تیرے حسن خلق سے شرمندہ ہو باد نسیم
تیرے اخلاص ووفا کا گیت گائے گا جہاں
تیری سعی و جستجو کو بھولے گا ندوہ کہاں ؟
باعث صد رشک تھی بے لوث یہ خدمت تری
تیری فرقت سے سبھی کے دل پہ ہے بجلی گری
زیب دیتا تھا تجھے المومن غرٌ کریم
صورت انور سے یاد آتا تھا بس ربِّ رحیم
دیکھ کر بے ساختہ کہتا تھا دل تکیہ ترا
حضرت رہبانؒ کی سنت کریں جیسے ادا
تیرے شوق و جذب دل، عشق الٰہی کا بیاں
ہے کہاں زور قلم، کہ لکھ سکوں یہ داستاں

غیر ممکن ہے کہ پُر ہوجائے یہ تیرا خلاء
ساتھ میں مدفون تیرے ہوچکا ہے حوصلہ
اس کے اوصاف حمیدہ کو کروں کیسے بیاں
حسن سیرت سے مزیّن جو رہے ہیں بے گماں
زخم دل کیوں کر بھرے جب درد کا درماں نہیں
سوگئے تم میٹھی میٹھی نیند اب زیرِ زمیں
ہوگئے محروم بام و در تیرے دیدار سے
عندلیبانِ چمن دکھڑا سنائیں گے کسے
تیری رحلت سے ہے سونی سونی یہ بزم جہاں
ہو نہ کیوں مضطر جدائیٔ سے امیرِ کارواں
بے حسی کا ہے سماں، خاموش وساکت ہے زباں
ذرہ ذرہ غم زدہ، پُر غم ہے چشم آسماں
کاوش و کاہش تری ندوے کی خاطر صبح وشام
زندگی تیری تھی اک خاموش وساکت پیام
ہیں شریک غم تمہارے ہم بھی اے پسماندگاں
اے خدا ان کا تو ہوجائے کفیل وپاسباں
اے زمانہ کیا کریں بے وجہ ہم شکوہ ترا
ہے سر تسلیم خم اپنا فقط پیش خدا
ملتجی ہے اشہر مضطر بھی اے رب جلیل
اقرباء واصدقاء کو دیدے اب صبر جمیل
اے خدائے ذوالجلال اے خالق کون ومکاں
جنت الفردوس دے اور قرب محبوب جہاں

مطبوعہ "تعمیر حیات" لکھنو فروری ۱۹۹۶ء

غم جدائی کا مجھے جینے نہ دے گا اے عزیز

سانحہ وفات والد محترم

از : ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز عزیز

روزگار زندگی سے یوں فراغت پاگئے
زندگی کے غم مٹے، اور حق کی قربت پاگئے
برسر میت سبھی کہنے لگے، عبدالسمیع
واصل رب ہوگئے، گلزار جنت پاگئے
کانپور مسکن تھا، پیدائش جہان آباد کی (۱)
سرزمین لکھنؤ، اب بہتر تربت پاگئے
پیکر علم و عمل، آئینہ ایثار و خلق
کام جو عقبیٰ میں آئے گی، وہ دولت پاگئے
دین کی تبلیغ جن کی زیست کا مقصد رہا
چھوڑکر دنیا کو، وہ آغوش رحمت پاگئے
اہتمام سنت نبوی رہا ہے، تاحیات
پیروی دین میں، اسرار وحدت پاگئے
غرق غم پسماندگاں، اہل خرد محو فغاں
آپ دنیا کے فرائض سے فراغت پاگئے
کل تلک تھے نغمہ زن، گلزار ندوہ میں مگر (۲)
بلبل شیریں بیاں، دنیا سے رخصت پاگئے

شاق ہے دل پر فراق حضرت عبدالسمیع
جب محبوب خدا میں، آپ راحت پاگئے
غم جدائی کا مجھے جینے نہ دے گا اے عزیز
بیقراری ہم نے پائی ہے، وہ جنت پاگئے

مطبوعہ ماہنامہ "محکمات" لکھنو، جنوری تا مارچ ۱۹۹۶ء

---

(۱) کوڑا جہان آباد (ضلع فتحپور) مراد ہے
(۲) دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو مراد ہے

اب آج جلوہ بار وہ تنویر نہیں ہے

بر سانحہ ارتحال مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

قاری ہدایت اللہ صدیقی

گلشن میں درخشندہ وہ تصویر نہیں ہے
اب آگے کسی خواب کی تعبیر نہیں ہے

مہکا رہا تھا گوشہ چمن کا چہار سو
سکّہ تھا دل پہ جس کا وہ دل گیر نہیں ہے

ارض چمن کا پوچھے نہ کوئی خراج اب
مغموم ہے دیوانہ بغل گیر نہیں ہے

پُر نور تھیں تابانیاں ہاں جس سے مسلسل
اب آج جلوہ بار وہ تنویر نہیں ہے

جس جا سے کوئی جاتا ہے ملتا ہے بدل کب
کہنے کو جگہ بھر گئی تاثیر نہیں ہے

ہونٹوں پہ تبسم لئے مصروف ہمہ تن
باتوں میں نئی بات کی تفسیر نہیں ہے

کیا دل پہ گزرتی ہے یہ احباب سے پوچھو
دلبستگی کے واسطے زنجیر نہیں ہے

مخفی بچا نہ شعبہ کا پست وبلند وکچھ
بے شک نگاہ ناز وہمہ گیر نہیں ہے

پُر نم نہ آنکھ کس کی ہوئی اپنے چمن میں
ایسا تو آج کوئی جواں، پیر نہیں ہے

وہ حال کہاں پہلے سا اب آج چمن کا
بن جائے یہ بگڑی ہوئی تقدیر نہیں ہے

ہوجائے کسی طرح غلط غم یہ جہاں کا
کیا اس کی کوئی دنیا میں تدبیر نہیں ہے

دل پر لگی جو ٹھیس وہ آئی زبان پر
قدرت کے کرشموں پہ یہ تکبیر نہیں ہے

کس کے لئے اٹھتی ہے کسک کتنی پتا کیا
اس میں کسی بھی شخص کی تحقیر نہیں ہے

سایہ بڑوں کا سر پہ خدایا ہو دیر تک
رحمت سے تیرے دور یہ تقدیر نہیں ہے

مغرور نہ ہو چھوڑ یہ رعنائی ہدایت
دنیا کسی بھی شخص کی جاگیر نہیں ہے

جانے والے تجھے میرا ڈھیروں سلام

داد جان کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہو کر

عذراء خاتون حیا (ریاض)

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرنے دو
کچھ کہہ کے ہمیں ہلکا غم کرنے دو
رہ رہ کے ستاتی ہے یاد ان کی
اشک کہتے ہیں آنکھوں پہ ستم کرنے دو
ہائے دے کر اچانک غم چل دیئے
چھوڑکر دادا ہمیں سوئے ارم چل دیئے
کتنے جلتے ہیں آنکھوں میں اشکوں کے چراغ
دے کر اپنی یاد ہائے لطف وکرم چل دیئے
آتا نہیں یقیں کہ وہ محفل سے اٹھ گئے
جدائی کا ہم کو اپنی ہائے داغ دے گئے
لیکن وہ جاچکے ہیں اور اداس ہے انجمن
ہائے جدائی سے اپنی سونی محفل کر گئے
اُف جب بھی تیری رحلت کا خیال آتا ہے
حیا، دل غم سے گویا پھٹا جاتا ہے
اب نہ مل پائیں گے تجھ سے کبھی، سوچ کر
دامنِ صبر رہ رہ کے چھٹا جاتا ہے

دل کو تڑپائے گی رہ رہ کے شفقت تیری
اشک برسیں گے جب یاد آئے گی الفت تیری
تجھے ڈھونڈیں کہاں اب، تجھے پائیں کہاں اب
اب تو خوابوں ہی میں آئے گی صورت تیری
آتا نہیں کسی پل دل کو مرے قرار
پھرتی ہے ان کی صورت نگاہوں میں بار بار
ہائے کس طرح اچانک دور ہوگئے ہم سے
ہم ہیں اور ان کی یادیں اشکبار
حال دل کا جو ہے وہ بتائیں کیسے
شدّت غم کو ہم اپنے چھپائیں کیسے
اشک ہوتے ہیں رواں ذکر ان کا سن کر
اپنے دادا کو ہم ہائے بھلائیں کیسے
پیش نظر رہا ترے اسوہ خیر الانام
پابندیِ نماز و تہجد کا اہتمام
تبلیغ اسلام میں مصروف تازیست
تلقین نیکیوں کی کرتے رہے مدام
جانے والے تجھے میرا ڈھیروں سلام
ترے نقش قدم پہ چلیں ہم مدام
لحد تیری نور سے معمور ہو
ملے تجھ کو جنت میں اعلیٰ مقام

"ہوا، چراغ ندوہ گل ہوا، جلیل"

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ

محمد عبدالرشید ندوی (ریاض)

دسمبر ۱۹۹۵ء کی ۲۷ تاریخ تھی اور بدھ کا دن اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا، اور میں کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا ڈاکٹر نصیر صاحب کے ایک سرٹیفیکٹ کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کررہا تھا، گھڑی پر نگاہ گئی تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے (ہندوستان میں اسوقت ایک بج رہا تھا اور جمعرات کا دن اور ۲۸ تاریخ شروع ہوچکی تھی) جیسے ہی میں نے سرٹیفیکیٹ چھاپنے کی کمانڈ دی ویسے ہی اچانک سامنے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی، گھنٹی بجتے ہی میں یکایک گھبرا سا گیا لیکن گھبرانے کی وجہ خود میری سمجھ میں نہیں آئی، یکایک ذہن میں یہ خیال آیا کہ کم سے کم پرنٹ آوٹ نکل آتا پھر یہ فون آتا تو اچھا تھا، اس درمیان گھنٹی بجتی رہی آخر ایک ہاتھ میں نے چھپتے ہوئے پرنٹ آوٹ کی طرف اور دوسرا فون کے رسیور کی طرف بڑھایا، فون پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شعبہ تعمیر وترقی کے شاہد صاحب مخاطب تھے، میں نے سوچا کوئی ذاتی ضرورت ہوگی اسلئے فون کیا ہے، میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کے لئے ایک افسوسناک خبر ہے مگر بتانا بھی ضروری ہے۔

میں نے کہا بتائیے، انھوں نے کہا کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، مجھے یقین نہ آیا مگر مزید تاکید کے لئے پوچھا کس کے والد کا؟ انھوں نے کہا آپ کے والد مولانا عبدالسمیع صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، پھر انھوں نے کچھ تفصیل بتائی۔

میں نے پوچھا بھائیوں میں سے یا میرے لڑکوں میں سے آپ کے پاس کوئی موجود ہے انھوں نے کہا ہاں سوائے عبدالحی (عرفی) کے سب موجود ہیں، میں نے عبدالرحمن سلمہ کو فون دینے کو کہا لیکن اسوقت تک میری حالت شدت غم سے اتنی غیر ہوچکی تھی کہ میں اس سے زیادہ گفتگو نہ کرسکا صرف اتنا کہا کہ تم لوگ خود اپنے ہاتھوں سے غسل دینا اور کفنانا، میں تو اتنی دور ہوں یہاں سے کچھ بھی نہیں کرسکتا، پھر فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

فون کی خبر کیا تھی؟ میرے لئے قیامت سے کم نہ تھی جس نے میرے دل ودماغ کی دنیا کو تہ وبالا کرڈالا، آنکھوں سے جب آنسوؤں کی برسات رکی تو برادر خورد عبدالجلیل حسینی ندوی سلمہ کو دبئی فون کیا، وہ نیند سے اٹھکر فون سننے آئے تھے اور یہاں شدتِ غم سے آواز نکلنا مشکل ہورہی تھی وہ حیران کہ اتنی رات میں کون فون کررہا ہے اور کچھ بول بھی نہیں رہا ہے، ادھر میں پریشان کہ کس طرح دل کو قابو میں کروں اور کس طرح اطلاع دوں، آخر بڑی مشکل سے میں نے گلوگیر آواز میں خبر دی، اس پر اس خبر سے کیا بیتی مجھے کچھ پتہ نہیں، البتہ رات تین بجے (دبئی کے چار بجے) کے بعد حبیب اللہ صاحب ندوی کا فون آیا کہ عبدالجلیل چار بجے دہلی کے لئے روانہ ہوگئے، آپ لکھنؤ ان کی آمد سے مطلع کردیں، عبدالجلیل سلمہ اسی روز لکھنؤ پہنچ گئے لیکن نماز جنازہ اور تدفین میں شریک نہ ہوسکے، جس کا انھیں بھی افسوس رہا اور مجھے بھی، لیکن پھر بھی مجھے ان کے لکھنؤ پہنچنے سے کچھ سکون ضرور ہوا۔

والد صاحب کی نماز جنازہ ندوہ میں بعد نماز عصر پڑھی گئی، اور تدفین ڈالی گنج لکھنؤ کے قبرستان میں ہوئی، ریاض میں بھی ان کی نماز جنازہ غائبانہ دو جگہ پڑھی گئی، اور حرم مکی میں بعض عزیزوں نے ان کی طرف سے طواف کیا اور ان کے لئے دعاء مغفرت کی۔

والد صاحب کی وفات کا حادثہ ایسا اچانک ہوا کہ ابھی تک نہ تو دل اس

کو قبول کرتا ہے اور نہ عقل ہی اس کو باور کرتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا (مگر موت تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کے آنے کا چار وناچار یقین کرنا ہی پڑتا ہے) جب والد صاحب کا خیال آجاتا ہے تو دل ودماغ کی عجیب کیفیت ہوجاتی ہے، رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ اب کبھی فون پر وہ مانوس آواز نہیں سنائی دے گی جس سے دل کو تسکین حاصل ہوتی تھی، اور نہ نگاہوں کو وہ مخصوص تحریر نظر آئے گی جس سے دل کی کلی کھل جاتی تھی، اب میں کس کے خط کا انتظار کروں گا، اور کس کی تحریر کو تلاش کروں گا؟ اب جب بھی کوئی خط آئے گا تو نگاہیں بے اختیار ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تلاش کریں گی اور ان کی مانوس اور جانی پہچانی تحریر نہ پاکر مایوس ہوجائیں گی، اور دل غم واندوہ سے بھر آئے گا۔

میں جب بھی ریاض سے لکھنؤ (ندوہ والے مکان میں) جاؤں گا تو بیساختہ میری نگاہیں ان کو اسی کمرہ میں اور اسی جگہ تلاش کریں گی جہاں وہ ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے تھے، یا ان کو اس صحن میں تلاش کریں گی جہاں وہ چہل قدمی کرتے تھے، میں جب بھی گھر سے بازار کے لئے نکلوں گا تو بے اختیار میرے قدم ان کے کمرے کی طرف اٹھ جائیں گے تاکہ ان سے معلوم کرسکوں کہ ان کو تو بازار کا کوئی کام نہیں ہے، اور جب بھی بازار سے گھر واپس آؤں گا تو ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ گھر پہنچتے ہی مجھ سے معلوم کریں گے کہ فلاں چیز لائے یا فلاں کام کیا؟ لیکن پھر یہ حقیقت خود بخود آشکارا ہوجائے گی کہ وہ تو اللہ کے جوارِ رحمت میں چلے گئے۔

میں جب بھی گھر سے نکل کر شعبہ یا نظامت کے دفتر جاؤں گا تو نگاہیں بے اختیار ان کو ان کی کرسی پر بیٹھا ہوا تلاش کریں گی، اور جب وہاں سے پلٹوں گا تو کان " عبدالرشید ذرا یہاں آنا" کی آواز سننے کے منتظر ہوں گے، میں جب بھی گھر سے مسجد کے لئے یا مسجد سے گھر کے لئے نکلوں گا تو کان

اپنے پیچھے یا آگے ان کے قدموں کی آہٹ سننے کے منتظر ہوں گے، غرض یہ کہ جب تک ندوہ سے اور ندوہ کے اس گھر سے میرا کوئی تعلق باقی ہے مجھے وہ ہر جگہ چلتے پھرتے، آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے نظر آئیں گے۔

ندوہ سے مجھے جو محبت وعقیدت ہے، اور اس سے میرا جو عقلی وذہنی، اور جذباتی وروحانی تعلق ولگاؤ ہے اسے میں خود بھی ختم کرنا چاہوں تو ختم نہیں کرسکتا، ندوہ میرے روئیں روئیں میں رچ بس چکا ہے، میرے انگ انگ میں سرایت کرچکا ہے، ندوہ ہی میرا ملک اور وطن ہے، ندوہ ہی میرا صوبہ اور شہر ہے، ندوہ ہی میرا گھر اور آنگن ہے، ندوہ ہی میری پرورش گاہ وتربیت گاہ ہے، ندوہ ہی میری مادر علمی اور درسگاہ ہے، اسی کی چہاردیواری کے اندر میں نے پرورش پائی، اسی کی سرزمین میں پلابڑھا، اسی کے احاطہ کے اندر میں نے بچپن کے سہانے ایام اور بے فکری کے دن گزارے، یہیں کے صاف ستھرے اوردینی ماحول میں میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں، یہیں سے مجھ کو دین وعلم کی بیش بہا دولت ملی۔

جب ندوہ سے مجھے اتنا تعلق اور محبت ہے تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ والد صاحب کو ندوہ سے کتنی محبت وعقیدت اور کتنا تعلق اور لگاؤ ہوگا، جس کی گود میں انھوں نے اپنی عمر کے کم وبیش ۵۰ سال گذارے، دس سال کی عمر میں ندوہ پڑھنے کے لئے آگئے، اور دس سال تک اس کے علمی چشموں سے اپنی پیاس بجھاتے رہے، پھر پندرہ سال دوسری جگہوں پر مزید علم وتجربہ حاصل کرنے کے بعد پھر دوبارہ اپنی مادر علمی ندوہ کی خدمت کرنے کے لئے اس کی آغوش میں آگئے، اور چالیس سال تک اس کی خدمت کرتے رہے اور اس پر فخر بھی محسوس کرتے رہے، یہاں تک کہ اپنی زندگی کا آخری دن بھی انھوں نے ندوہ کی خدمت میں گذارا، میں نے ان سے کئی بار زبانی بھی کہا اور خطوط میں بھی لکھا کہ اب آپ ندوہ سے استعفاء دیدیں اور بڑھاپے کے یہ

ایام آرام وسکون اور بے فکری سے گذاریں، لیکن وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور ندوہ کی خدمت میں لگے رہے، ندوہ کو وہ اپنی ملازمت کی جگہ نہیں بلکہ اپنا گھر سمجھتے تھے اور کوئی شخص اپنے گھر کی دیکھ بھال جتنی فکرمندی، دلسوزی اور خلوص کے ساتھ کرسکتا ہے اس سے بڑھ کر فکرمندی، دلسوزی اور خلوص سے وہ ندوہ کی خدمت کرتے رہے۔

ایک بار دادا مرحوم مولانا سید محمد عبدالحی نے والد صاحب کو خط کے ذریعے "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ اسلام کانپور" کے کاموں کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ کیا تو والد صاحب نے جواب دیا کہ ندوہ اور جمعیۃ دونوں کے کام ایک وقت میں دیکھنا ممکن نہیں ہے، آپ کی رائے ہو تو ندوہ سے استعفاء دے کر کانپور آجاؤں اور جمعیۃ کا کام دیکھوں تو دادا نے اپنے خط مورخہ ۳ جولائی ۱۹۶۹ء میں والد صاحب کو ندوہ چھوڑنے سے منع کیا اور تحریر فرمایا:

"..... تم ندوہ سے اپنا تعلق منقطع کرکے کان پور میں قیام کرو اور پھر جمعیۃ کے کاموں کو دیکھو یہ خیال ترک کردو، تمہارے لئے ندوہ سے وابستہ رہنا ماحصل زندگی ہے اور یہی تمہاری زندگی کا مقصد ہے اسی میں دین ودنیا کی بھلائی ہے الاّ یہ کہ قدرت کی طرف سے ایسے اسباب پیدا ہوجائیں اور تمہاری وابستگی خود ندوہ کے ارباب حل وعقد ختم کردیں"

چنانچہ والد صاحب ہمیشہ ندوہ میں قیام کو اپنے دین ودنیا کی بھلائی سمجھتے رہے اور پوری دلجمعی اور اخلاص کے ساتھ ندوہ کی خدمت کرتے رہے، اور جب ان کو دادا مرحوم مولانا سید محمد عبدالحیؒ کے انتقال کے بعد "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور" کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا تو جمعیۃ کے مفادات کی نگرانی کے لئے کانپور میں ایک صاحب کو متعین کیا، اور خود جمعہ کی چھٹی میں کانپور جاکر جمعیۃ کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے، جمعیۃ کا ماہنامہ "محکمات"

البتہ وہ بعض انتظامی مصلحتوں کی وجہ سے لکھنؤ سے نکالتے رہے۔

یہ ان کا اور میرا ندوہ سے تعلق اور محبت کا ایک ادنیٰ سا اظہار اور فکری ہم آہنگی اور توارد ذہنی ہی ہے کہ جب ندوہ کے احاطہ سے متصل انھوں نے میرے لئے ایک مکان کی زمین خریدی اور مکان بننا شروع ہوا تو میں نے سوچا کہ میں اپنے مکان کا نام " ندوی منزل " رکھوں گا، کچھ ہی عرصہ کے بعد مجھے والد صاحب کا خط ملا کہ اپنے مکان کا نام "ندوی منزل" رکھدو، اور میری یہ بھی خواہش ہے کہ " ندوی منزل " کا یہ کتبہ تمہاری موجودگی میں حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کے ہاتھوں سے لگوایا جائے، میں نے لکھدیا کہ خود میری بھی یہی خواہش ہے، البتہ پتہ میں میں نے " ٹیگور مارگ " کے بجائے " ندوہ روڈ، لکھنؤ" کا اضافہ کردیا، (جسے بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی پسند کیا اور اپنی مطبوعات میں پتہ کے طور پر " ندوہ روڈ" کا اضافہ کردیا)۔ میں جب مختصر تعطیلات میں ندوہ پہنچا تو والد صاحب نے کتبہ میرے سامنے رکھدیا، کتبہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور مجھے ندوہ سے ان کی عقیدت و محبت کا اندازہ ہوا، ان کو جیسے کتبہ لگانے کی جلدی تھی اسی وجہ سے انھوں نے اس کو میرے آنے سے پہلے ہی تیار کراکے رکھ لیا تھا، ان دنوں حضرت مولانا کا لکھنؤ کا کوئی قریبی پروگرام نہیں تھا اور والد صاحب کو صرف اس غرض کے لئے حضرت مولانا کو زحمت دینا گوارا نہ تھا، اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا چنانچہ ندوہ سے میری روانگی سے ایک دن پہلے " ندوی منزل" ندوہ روڈ، لکھنؤ" کا کتبہ میرے مکان پر نصب کردیا گیا۔

وہ جب مجھے خط لکھتے اور اس مکان کا تذکرہ کرتے تو عموماً " ندوی منزل" ہی لکھتے، ادھر چار پانچ ماہ سے ندوہ والے مکان میں تنگی کی وجہ سے وہ "ندوی منزل" ہی کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے، کھانے پینے کے علاوہ باقی سارا وقت " ندوی منزل " ہی میں گذارتے اور رات بھی وہیں بسر کرتے، ان کے ساتھ

عموماً میرے لڑکے عبدالحمید وعبدالوحید تھما یا ایک عزیز کا لڑکا ابو ذر ساتھ ہوتا، میں نے ان کو کئی بار لکھا اور گھر والوں نے بھی کہا کہ آپ وہاں نہ جایا کریں تو جواب دیتے کہ مجھے وہیں سکون ملتا ہے۔ ندوی منزل میں شاید ان کو اس لئے زیادہ سکون ملتا تھا کہ اس مکان کو مجھ سے بھی نسبت تھی اور ندوہ سے بھی نسبت تھی، اور یہاں آکر ان کی روحانی وجذباتی دونوں محبتوں کی تشنگی دور ہوتی تھی۔

اپنی زندگی کی آخری رات بھی وہ " ندوی منزل" میں گذارنے آئے، ابو ذر ان کے ساتھ تھا، وہ ساڑھے دس بجے تک جاگتا رہا اسوقت وہ کوئی اخبار یا رسالہ پڑھ رہے تھے، پھر وہ سوگیا (غالباً ابھی سونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ) تقریباً ۱۲ بجے شاید دل میں اچانک تکلیف محسوس ہوئی، گرم کپڑے پہنے، گھر میں تالا ڈالا اور ندوہ والے مکان کے لئے روانہ ہوگئے، جب اندازہ ہوا ہوگا کہ گھر پہنچنا مشکل ہے تو ایک مکان چھوڑ کر "پاریکھ پریس" کے دروازے پر دستک دی (جو ندوہ سے متعلق افراد کا ہے) اور فرمایا " میری طبعیت زیادہ خراب ہے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو یا ڈاکٹر کو یہاں بلواؤ، پھر فرمایا طبیعت زیادہ بگڑ رہی ہے مجھے لٹادو، لوگوں نے انھیں لٹادیا، پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور فرمایا بارہ بجے ہیں اس وقت کون ڈاکٹر ملے گا؟ لوگ ندوہ والے گھر میں خبر کرنے اور اسپتال کے لئے گاڑی کا انتظام کرنے ندوہ کی طرف بھاگے ادھر " یاایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضية مرضية فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" کا پیغام آگیا اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرکے اپنے مالک حقیقی سے جاملی " انا للہ وانا الیہ راجعون" چند منٹوں میں کیا سے کیا ہوگیا، ہم لوگوں کی تو دنیا ہی بدل گئی۔

والد صاحب کا وقت موعود جیسے جیسے قریب آتا جارہا تھا اور ان کی حیات مستعار کے دن کم ہوتے جارہے تھے ویسے ویسے ان کو اپنی موعودہ گھڑی

کے آنے کا احساس بڑھتا جارہا تھا، خاص طور پر مولانا مرتضی مظاہریؒ (متوفی ندوہ لکھنو، اکتوبر ۱۹۹۵ء) سابق ناظر شبلی کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی وفات کے بعد تو جیسے ان کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ اب ان ہی کی باری ہے اور جلدی ہی آنیوالی ہے، یہ بات انھوں نے کئی بار ندوہ میں متعدد لوگوں سے کہی بھی تھی، مولانا خالد غازیپوری ندوی کا بیان ہے:

حضرات! ابھی چند روز پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ وناظر کتب خانہ حضرت مولانا مرتضیٰ صاحب مظاہری کا سانحہ ارتحال پیش آیا ہم سب ان کی تدفین میں حاضر تھے، ایک طرف مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی مرحوم نڈھال سے بیٹھے ہوئے تھے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے ایک دیرینہ رفیق اور مخلص دوست کے بچھڑجانے پر جتنا غم انہیں تھا ان کے چہرے کے ارتسامات سے اس کا بخوبی اندازہ ہورہا تھا، مرحوم نے مجھے دیکھ کر فرمایا" آج مولانا رخصت ہوگئے کل تم لوگ اسی طرح سے مجھے بھی یہاں لے آؤگے" ۔ آواز سے ضعف ونقاہت کا اظہار ہورہا تھا، سہارا دیکر اٹھایا اور باہر سڑک تک لایا، پھر ندوہ تک ایک ہی رکشہ پر ساتھ آنا ہوا، راستہ میں بار بار مولانا مرتضیٰ صاحب مرحوم کا بڑے درد کے ساتھ تذکرہ کرتے رہے، آج موصوف کا یہ جملہ" تم لوگ مجھے بھی یہاں لے آؤگے" ایک حقیقت بن چکا ہے، ہم لوگ ابھی ابھی ان کی تدفین سے فارغ ہوکر آئے ہیں اور اب اس وقت مسجد میں تعزیت کے لئے جمع ہیں۔

بہت سے کم عقل اور جاہل لوگ کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کی جگہ کو منحوس خیال کرتے ہیں یا وہاں جانے سے گھبراتے اور وحشت محسوس کرتے ہیں، لیکن میں جب "ندوی منزل" پہنچا تو بجائے

کسی وحشت یا گھراہٹ کے بڑی کشش محسوس ہوتی خاص طور پر ان کا وہ کمرہ جس میں وہ آرام کرتے تھے، اور جب سارا عالم سوتا تھا تو وہ اپنے رب کے حضور کھڑے ہو کر اس سے راز ونیاز میں مشغول ہو جاتے تھے، جہاں نہ ان کو کوئی دیکھتا تھا اور نہ وہ کسی کو دیکھتے تھے، رات کی تنہائی اور سناٹے میں صرف وہ ہوتے تھے اور ان کا رب ہوتا تھا، نماز تہجّد سے فارغ ہو کر وہ تلاوت قرآن مجید، ذکر ودعاء اور مناجات میں مشغول ہو جاتے، یہ ان کی تہجّد کی نمازوں ذکر وتلاوت اور مناجاتوں ہی کی برکتیں وانوار ہیں کہ آج بھی ان کے مسکونہ کمرے میں خواہ وہ ندوہ والے گھر کا ہو یا " ندوی منزل" کا ہو ایک کشش اور روحانیت سی محسوس ہوتی ہے۔

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں " تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً ومما رزقناھم ینفقون (السجدہ آیت ۱۶) کے الفاظ میں مومن بندوں کے جو اوصاف بیان کئے ہیں وہ اس کی سچی تصویر تھے، اور ان کا یہ معمول برسوں پرانا تھا، غرض یہ کہ وہ " ندوہ" ہو یا " ندوی منزل" ہر جگہ ان کی خوشبو رچی بسی معلوم ہوتی ہے، اور دونوں جگہ جاکر عجیب طرح کا اطمینان وسکون محسوس ہوتا ہے۔

" ندوی منزل" آج بھی ان کی دعائے نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کے زمزموں سے معمور ہے، اور وہاں کی فضاؤں میں آج بھی ان کے ذکر وتلاوت کی صدائیں گونجتی محسوس ہوتی ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ریاض سے مستقل واپسی کے بعد والد صاحب کو اپنے پاس " ندوی منزل" میں رکھنے کا میرا جو ارادہ تھا وہ تو پورا نہ ہو سکا البتہ مشیّت الٰہی نے میری غیر موجودگی میں ان کی وہاں رہائش کے اسباب پیدا کر دیئے، اور تقریباً پانچ ماہ وہ " ندوی منزل" میں رہ لئے جس کا نام انھوں نے بڑے شوق واہتمام سے رکھا تھا، اب میں جب بھی " ندوی منزل" میں رہائش اختیار کروں گا تو انشاء اللہ مجھے وہاں ان کی

روحانی رفاقت حاصل ہوگی، ان کے ذکر وتلاوت کی آوازیں مجھے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہونگی، ان کے آنے جانے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے کا احساس ہوگا، نگاہیں ان کے زیر استعمال چیزوں پر ان کے نادیدہ لمس کو محسوس کریں گی۔

غرض کہ والد صاحب کی رحلت صرف ہم پسماندگان ہی کے لئے نہیں بلکہ ندوہ کے لئے اور "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور" کے لئے ایک بڑا خسارہ ہے، ندوہ ایک مخلص اور محنتی کارکن سے خالی ہوگیا، شعبہ تعمیر وترقی اپنے مربی ونگراں سے محروم ہوگیا، جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور اپنے سرپرست سے اور رسالہ "محکمات" اپنے مدیر سے محروم ہوگیا۔

نام وخاندان:

محمد عبدالسمیع نام اور تاریخ پیدائش ۲۱ دسمبر ۱۹۲۰ء ہے، تاریخی نام فروغ احمد تھا جس سے ۱۳۳۹ھ کا سال برآمد ہوتا ہے، وہ اپنا یہ تاریخی نام (طالب علمی کے زمانے میں) مضامین اور خطوط میں استعمال کرتے تھے، عیسوی سال وفات اس جملے سے برآمد ہوتا ہے "ہوا چراغ ندوہ، گل ہوا، جلیل" اور ہجری سال وفات "فروغ احمد عابد" سے نکلتا ہے، عیسوی اعتبار سے ۷۵ سال اور ہجری اعتبار سے ۷۷ سال ۷ ماہ کی عمر پائی۔

والد کا نام سید محمد عبدالحی ہے، والد اور والدہ دونوں کی طرف سے سلسلہ نسب سیدنا حسین بن سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما پر ختم ہوتا ہے، ان کا تعلق سادات کے اس جعفری عریضی خانوادہ سے ہے جو ۶۲۱ھ میں مدینہ منوّرہ کے نواحی علاقے "عریض" سے روم منتقل ہوا، پھر وہاں سے مختلف ملکوں میں ہوتا ہوا سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ہندوستان آیا، اور سکندر شاہ لودی کے زمانے میں قصبہ "کوڑا" کے محلہ میاں ٹولہ میں

سکونت پذیر ہوا، اس خاندان کی اکثریت اب بھی اسی قصبہ میں آباد ہے۔

تعلیم :

ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالارشاد، قصبہ " کوڑا" ضلع فتح پور (ہسوہ) میں حاصل کی، ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں یہاں سے فارغ ہوکر اسی سال مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند چلے گئے، وہاں ۱۹۴۴ء تک تعلیم حاصل کی، دارالعلوم دیوبند کے " دارالحدیث " میں انگریزوں کے خلاف تقریر کی، پولیس نے گرفتار کرنا چاہا تو کانپور روانہ ہوگئے، لیکن پولیس مسلسل تعاقب میں رہی، جس سے بڑی مشکل سے کسی اسٹیشن پر پیچھا چھڑایا اور مختلف شہر ہوتے ہوئے کانپور پہنچے، ۱۹۴۴ء تک سی آئی ڈی آفس میں فائل کھلی رہی، پھر فائنل رپورٹ لگا کر بند کردی گئی۔ جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں سے چند اہم اساتذہ یہ ہیں :

۱۔ مولانا محمد شبلی فقیہؒ

۲۔ مولانا حیدر حسن خاںؒ

۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۴۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

۵۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ

۶۔ مولانا سید فخر الدین مراد آبادیؒ

۷۔ مولانا حکیم سید شاہ ابو طاہرؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ مولانا حکیم سید شاہ ابو طاہرؒ (سجادہ نشین خانقاہ حضرت شاہ غلام رسول، رسول نما، کانپور) سے طب اور ہومیوپیتھک کی تعلیم حاصل کی، اور خوشخطی بھی سیکھی، میں نے ان کے ہاتھ کی خوشخط لکھی ہوئی سورہ بقرہ دیکھی ہے،

قرآن کریم کے بعض اجزاء انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بعض احباب کو بھی دیئے تھے۔ تجوید بھی سیکھی تھی، بڑے خوش الحان قاری تھے، استاذ گرامی مولانا برہان الدین صاحب کا بیان ہے کہ جب وہ ندوہ آئے تو ایک روز فجر کی نماز میں قرات سن کر محسوس ہوا جیسے مولانا قاری طیب صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) قرات کررہے ہیں، ان کی آواز سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ قاری صاحب ندوہ آئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا، نماز کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی (مرحوم) نماز پڑھارہے تھے، قاری صاحب کے لب ولہجے میں ان کی قرات سن کر تعجب ہوا کہ یہ انداز انھوں نے کیسے اپنالیا، بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا نے صرف ندوہ ہی میں نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

کلکتہ میں طبابت:

کلکتہ کے مشہور طبیب حکیم سمیع اللہ میکش انصاری جب سابق مشرقی پاکستان منتقل ہونے لگے تو انھوں اپنی موجودگی میں مولانا کو اپنے " دیسی دواخانہ " (واقع بولائی دت اسٹریٹ، کلکتہ) کا ذمہ دار بنادیا، اور مالکانہ حقوق اپنے داماد حکیم محمد عبدالوحید کو دیدیئے۔ والد صاحب تقریبا دو سال (۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۵ء) اس مطب میں طبابت کرتے رہے، لیکن کلکتہ کی آب وہوا راس نہیں آئی اس لئے کلکتہ کو خیر باد کہہ کر اپنے والد کے پاس کانپور آگئے، والد صاحب کے کلکتہ کا یہ دو سالہ قیام اور وہاں کے لوگوں سے شناسائی بعد میں ندوہ کے لئے مالیات کی فراہمی میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔

حکیم سمیع اللہ میکش انصاری شاعر بھی تھے، میکش تخلص تھا، طبابت کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" کے مبلّغ بھی رہ چکے تھے جس کے معتمد تبلیغ میرے دادا مولانا سید محمد عبدالحیؒ تھے، اسی

نسبت سے انھوں نے والد صاحب کو اپنا مطب سونپ دیا تھا۔ یہی وہ حکیم صاحب ہیں جنھوں نے مولوی فصیح الزماں مبلّغ انجمن تبلیغ اسلام ناگپور کے ساتھ مل کر بڑی سعی و کوشش سے ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء میں گلدھی جی کے لڑکے "ہیرا لال" کو مسلمان کیا تھا، اور اس کی صدارت میں جمعیۃ نے ۱۹۳۶ء میں ایک آل انڈیا کانفرنس کانپور میں منعقد کی تھی، بعد میں اس نے آریہ دھرم اختیار کرلیا۔ عبدالمجید دھولپوری صاحب کے ایک خط مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء بنام والد مرحوم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرا لال آج بھی بمبئی میں مقیم ہے، پتہ نہیں اب زندہ بھی ہے یا مرگیا۔

آج بھی والد صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے طبی نسخے کئی کاپیوں میں محفوظ ہیں، حکیم سمیع اللہ میکش مرحوم کے داماد حکیم عبدالوحید صاحب جو خود بھی حکیم تھے ذیابطیس کے بیمار تھے اور انسولین کے انجکشن لگواتے تھے انھوں نے اپنے مرض کا والد صاحب سے ایک ماہ علاج کرایا اور بالکل صحت یاب ہوگئے تو انھوں نے ان کو ایک سرٹیفکیٹ ۲۵ نومبر ۱۹۵۴ء کو دیا جس میں تحریر تھا " میں ذیابطیس کا اتنا بیمار تھا کہ مجھے انسولین کے انجکشن لگائے جاتے تھے لیکن مرض ختم نہیں ہوتا تھا، میں نے حکیم سید محمد عبدالسمیع ندوی کا ایک ماہ علاج کیا اور میں بالکل ٹھیک ہوگیا، میں دوسرے حضرات کو ان سے علاج کرانے کا مشورہ دیتا ہوں"

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تقرری:

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے مکتبہ " الجمعیۃ التعاونیۃ" میں بحیثیت منیجر تقرر ہوا، ندوہ میں ملازمت سے پہلے اس میدان میں وہ کئی سال لگا چکے تھے، اور " ہندوستانی کتاب گھر" کانپور اور " شبلی بکڈپو" نظیر آباد، لکھنؤ میں کام کرکے اس کا عملی تجربہ بھی حاصل کرچکے تھے، اس وقت تک

ندوہ کا یہ مکتبہ صرف چند اردو درسی کتابیں ہی شائع کرتا تھا، کام بڑا محدود تھا، تعلیمی سال کے ابتدائی چند مہینوں کے علاوہ باقی سال کتابوں کی فروخت برائے نام ہوتی تھی، والد صاحب نے اپنی بیکاری کا تذکرہ ذمہ داروں سے کیا اور مزید کام کا مطالبہ کیا تو چند گھنٹے دارالعلوم میں عربی تعلیم دینے کے لئے بھی لگادیئے گئے، لیکن والد صاحب کو بیکاری اب بھی گراں گذرتی تھی، اور مزید کام کا تقاضہ اب بھی باقی تھا چنانچہ ندوہ کے ذمہ داروں نے ایک ایسے شعبہ کے قیام کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو ندوہ کے لئے مالیات کی فراہمی اور عمومی تعارف ورابطہ کا کام کرسکے۔

شعبہ تعمیر وترقی کا قیام اور اس کی خدمات:

یکم اگست ۱۹۵۸ء میں "شعبہ تعمیر وترقی" کا قیام عمل میں آیا مولانا معین اللہ صاحب ندوی کو اس کا ناظر اور والد صاحب کو ان کا معاون مقرر کیا گیا، اس زمانہ میں ندوہ کی آمدنی بڑی محدود تھی، اس لئے شعبہ کے قیام کا اصل مقصد مالیات کی فراہمی، عمومی رابطہ وتعارف، اور تعمیری وترقیاتی وسائل کی فراہمی اور تعمیری کاموں کی نگرانی کرنا تھا۔ آگے چل کر مکتبہ "الجمعیۃ التعاونیۃ" کو بھی "مکتبہ دارالعلوم" کے نام سے شعبہ کے زیر انتظام کردیا گیا، اور عربی درسیات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو درسیات کی اشاعت ازسرنو شروع ہوئی، شعبہ نے "عربی پریس" بھی لگایا جس میں ندوہ کے عربی ترجمان ماہنامہ "البعث الاسلامی" اور پندرہ روزہ "الرائد" کمپوز ہوکر شائع ہونے لگے، پھر نومبر ۱۹۶۳ء میں عمومی رابطے کے لئے ایک اردو پندرہ روزہ "تعمیر حیات" بھی شعبہ کے زیر نگرانی جاری کیا گیا، یہ تینوں پرچے الحمد للہ آج بھی نکل رہے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔

مالیات کی فراہمی اور اسفار:

ندوہ میں شعبہ تعمیر وترقی کے لئے مالیات کی فراہمی کے لئے خود پہل کی اور سب سے پہلے کلکتہ کو اپنا ہدف بنایا جہاں طبابت کے سلسلہ میں دوسال قیام کر چکے تھے اور مسلمان تاجروں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی خاص طور پر چمڑے کے تاجر حضرات سے مالیات کی فراہمی کی زیادہ امید تھی، کلکتہ کا یہ سفر جناب مفتی محمد ظہور صاحب ندوی کی رفاقت میں ہوا، والد صاحب کے پرانے تعلقات وشناسائی اور ندوہ سے متعلق دوسرے حضرات کے تعلق کی وجہ سے کلکتہ میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی، جس سے مزید ہمت بڑھی اور پھر مختلف شہروں میں چندہ کی وصولیابی کے لئے پیش رفت کی، بعض جگہ خود گئے بعض جگہ دوسروں کو بھیجا، بعض جگہ کے لئے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ سے اور بعض دیگر متعلقین ندوہ سے خطوط لکھوائے، یہانتک کہ چندہ کی وصولیابی کا باقاعدہ نظام قائم ہوگیا، اور پورے ہندوستان میں معاونین کا ایک حلقہ بن گیا، اور سفراء کا جال بچھ گیا۔

دفتر کے اوقات کے علاوہ بارہا ایسا ہوا کہ شہر سے کوئی واقف کار یا اجنبی آیا اور والد صاحب کو پوچھا اور ندوہ کے لئے کوئی لمبی رقم دے کر چلا گیا، یا والد صاحب اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے ملنے دوسرے شہر گئے تو ان لوگوں نے ندوہ کے لئے لمبی لمبی رقمیں والد صاحب کے حوالہ کردیں، ایک سال پہلے جب میں ان کو ہتگام ضلع فتحپور لیکر عبدالرحمن سلمہ کی سسرال حکیم عبدالحق صاحب کے گھر گیا تو کھانے کے بعد انھوں نے تین ہزار روپیہ ندوہ کے لئے زکوٰۃ کی مد میں دیئے، لکھنؤ آکر والد صاحب نے اس کی رسید ان کو روانہ کردی۔

ندوہ کے لئے رقم وصول کرتے تو پوری خود داری اور اعتماد کے ساتھ وصول کرتے، ایک بار فرمایا کہ کلکتہ کے سفر میں ایک صاحب نے کئی بار

دوڑایا تو مجھے غیرت بھی آئی اور غصہ بھی آیا پھر جب ان کے پاس گیا تو ان سے کہا کہ آپ ندوہ کو چندہ دے کر مجھ پر یا ندوہ پر کوئی احسان نہیں کررہے ہیں بلکہ اپنا فرض ادا کررہے ہیں، میں یہی کہنے آپ کے پاس آیا تھا، اگر آپ کو کوئی رقم دینا ہے تو میری رہائش گاہ پر پہنچادیں، میں اب یہاں کوئی رقم نہیں وصول کروں گا، آخر انہوں نے شرمندگی کا اظہار کیا اور رقم رہائش گاہ پر پہنچائی۔

۱۹۶۵ء میں مالیات کی فراہمی کے لئے مالیگاؤں تشریف لئے گئے تو دوران سفر ہی آب وہوا کی تبدیلی اور غذا کی ناموزونیت کی وجہ سے پیٹ کے السر اور آنتوں کی سوزش میں مبتلا ہوگئے، حالت انتہائی خراب ہوگئی، اور علالت کا یہ سلسلہ نو ماہ تک دراز ہوگیا، یہاںتک کہ ساری چھٹیاں اور رخصتیں ختم ہوگئیں، اور بالآخر ندوہ سے تنخواہ ملنا بھی بند ہوگئی، تقریباً چھ ماہ مکمل صاحب فراش رہے، اٹھنا، بیٹھنا اور چلنا پھرنا بھی دشوار تھا، وہ دور اہل خانہ پر بڑی عسرت وتنگی اور آزمائش وابتلاء کا تھا، علاج ومعالجہ اور گھر کے اخراجات قرضوں پر چلتے رہے، بعض عزیزوں نے بھی مدد کی، جب بستر سے اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئے اور دفتر جانا شروع کردیا تو ندوہ کی تنخواہ دوبارہ بحال ہوئی، تقریبا ۲۵ حکیم، ڈاکٹر، ہومیوپیتھ کے مسلسل علاج ومعالجہ سے مرض مکمل طور پر تو چلاگیا لیکن پہلے جیسی صحت وتندرستی دوبارہ واپس نہ آسکی، سب سے زیادہ فائدہ کانپور کے ایک نو عمر ڈاکٹر خالد راشد سولیجہ کے علاج سے ہوا جو اس وقت میڈیکل کالج میں غالباً ایم۔ایس کررہے تھے، اسی دوران ان کو مزید تعلیم کے لئے امریکہ جانے کا موقع مل گیا تو وہ امریکہ چلے گئے اور اس طرح والد صاحب کا علاج ادھورا رہ گیا، والد صاحب کبھی کبھی گھر میں بھی ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، علاج ومعالجہ سے متعلق والد صاحب کی خود نوشت تحریر پیش خدمت ہے:

"وہ معالجین جنکا علاج باقاعدگی سے چلا درج ذیل ہیں:

(۱) حکیم محمد شفیع صاحب (۲) ڈاکٹر چٹرجی صاحب (۳) حکیم مسیح الزماں صاحب (۴) ڈاکٹر دھون صاحب (۵) ڈاکٹر فضل اللہ صاحب (۶) حکیم شکیل احمد صاحب (۷) ڈاکٹر رضا صاحب (۸) ڈاکٹر مکرجی صاحب (۹) ڈاکٹر فریدی صاحب (۱۰) حکیم شمس الدین صاحب (۱۱) ڈاکٹر شرماجی صاحب (۱۲) حکیم مشتاق حسین صاحب (۱۳) حکیم ضیاء الدین صاحب (۱۴) ڈاکٹر سولیجہ صاحب (۱۵) ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب

وہ معالجین جنکا علاج دو تین یوم سے زیادہ نہ چل سکا یا معاملہ زبانی حال پر تھا، زبانی تجویز پر تھا:

(۱) حکیم عطاء الرحمان صاحب (۲) مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب (۳) حکیم فقیر الدین صاحب (۴) مجھاون والے حکیم صاحب (۵) حکیم افتخار احمد صاحب (۶) حکیم افہام اللہ صاحب (۷) حکیم منظور احمد صاحب (۸) ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب (۹) ڈاکٹر رفیق حسین صاحب (۱۰) ڈاکٹر (نزد حکیم افتخار صاحب) (۱۱) ڈاکٹر عبدالصمد صاحب"

شعبہ میں جب کام کی زیادتی ہوتی خصوصاً رجب کے مہینے سے ذی الحجہ کے مہینے تک (سفراء کی روانگی کا پروگرام بنانا، ان کو روانہ کرنا، ان سے خط وکتابت کرنا، ان کی مطلوبہ پمفلٹ اور رسیدیں ڈاک سے روانہ کرنا، مختلف علاقوں کے سفراء کی ارسال کی ہوئی رقم کی پختہ رسید بھیجنا وغیرہ) تو دفتر کا کام گھر لے آتے، کبھی کبھی ہم لوگ بھی انکے ساتھ شریک ہوجاتے اور کبھی دفتر میں بیٹھ کر ہی کام کرتے، مولانا محب اللہ صاحب ندویؒ (سابق مہتمم دارالعلوم) عموماً جب رمضان کی تعطیلات میں کانپور جاتے تو دفتر دارالعلوم کے سارے کام والد صاحب کے ذمہ کرجاتے، رمضان کی تعطیلات میں اکثر ایسا ہوتا کہ ندوہ کے اہم ذمہ داروں میں سوائے والد صاحب کے کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور

ندوہ کی ساری دیکھ بھال والد صاحب ہی کے ذمہ ہوتی۔

شعبہ تعمیر وترقی اور بعد میں دفتر نظامت کی جو اہم اہم ذمہ داریاں والد صاحب کے سپرد تھیں اس سلسلے کی ایک تحریر والد صاحب کے کاغذات میں دستیاب ہوئی ہے جو انھوں نے مولانا معین اللہ صاحب ندوی ناظر شعبہ تعمیر وترقی کی فرمائش پر ناظم ندوۃ العلماء کے نام لکھی تھی، تحریر فرماتے ہیں:

بخدمت گرامی محترم جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء دام مجدہ

جناب عالی! گذارش ہے کہ میں اب تک شعبہ تعمیر ترقی کے معاون ناظر کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہوں، دفتری نظم ونسق کے سوا خاص طور پر مالیات کی فراہمی نیز رابطہ وتعارف عمومی کی جانب زیادہ متوجہ ہونا پڑتا ہے سفراء و محصّلین کے اسفار کے لئے حلقے بنانا، تعارفی مراسلات جاری کرنا، انکی واپسی پر ان کے حسابات تیار کرکے منظوری لینا، سال تمام کے حسابات کا جائزہ لینا ہوتا ہے، مخیران کے نام شکریہ کے مراسلات جاری کرنے ہوتے ہیں۔

خازن شعبہ کی عدم موجودگی یا مصروفیت کی وجہ سے بالعموم ذریعہ رجسٹری اور منی آرڈر رقوم وصول کرکے انکی رسیدات ومراسلات بھی جاری کرنا ہوتے ہیں۔

بالخصوص رمضان المبارک میں یہ کام خاصہ بڑھ جاتا ہے، حضرات اساتذہ کے لئے سفارتی حلقے متعین کرنا ہوتے ہیں، تعارفی مراسلات جاری ہوتے ہیں، رزرویشن کرانا ہوتا ہے، حضرات اساتذہ کو سفر کے لئے آمادہ کرنے میں خاصی مشکلات پیش آتی ہیں یہ کام ہمکو ماہ رجب ہی سے شروع کرنا ہوتا ہے، فہرستیں تیار ہوتی ہیں، عمومی اور خصوصی مراسلات جاری کرنا ہوتے ہیں۔

پھر آخر رمضان میں عید الفطر کے موقع پر مالیات کی

فراہمی کا بھی نظم کرنا ہوتا ہے، افراد واشخاص کا تعین، ان کے لئے سہولتیں فراہم کرنا ہوتی ہیں۔ تعطیلات میں گھر پر بھی کام کرنا ہوتا ہے اور یہ تعطیل اسی قسم کی مصروفیات میں گذرتی ہے۔

سال گذشتہ یکم ربیع الاول سے دفتر نظامت میں بھی مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی گئی تھی، یہاں بلوں کی میزانوں کی چیکنگ، واوچروں سے مطابقت کرنا کرانا ہوتی ہے، نیز مختلف دفاتر سے آئی ہوئی بر آوردوں کی میزانیں بھی دیکھنا ہوتی ہیں، نیز مختلف دفاتر سے آمدہ رقوم ہر مد کے ارسال پر چڑھا کر بینک بھیجنا ہوتی ہیں، بسااوقات تو ایک ایک بر آورد کی دیکھ بھال میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں تب ہی رقوم کی دہایید کرائی جاتی ہیں۔

بعض بعض کھاتوں کے اندراجات واوچروں سے ملانا ہوتے ہیں، غلطی ہوتی ہے تو اسکی اصلاح کرانا ہوتی ہے،اس کام میں بھی خاصہ وقت صرف ہوتا ہے، دفتر نظامت کے ان کاموں کے علاوہ شعبہ طبع واشاعت کی درسی کتب کی طباعت واشاعت کے سلسلہ میں مجھ کو فکر کرنا ہوتی ہے، اور کام لینا ہوتا ہے۔

یہ چند موٹے موٹے کام ہیں جنکی اطلاع دینا واجب تھا اس لئے عرض کیا۔

والسلام مع الاکرام
محمد عبدالسمیع ندوی

ماسٹر ہارون رشید صاحب (ناظر معهد دارالعلوم) جو ایک سال شعبہ میں محصل رہے پھر استاد ہوگئے وہ دس سال تک برابر رمضان میں بنگلور ومدراس مالیات کی فراہمی کے لئے جاتے رہے وہ والد صاحب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :

" میں نے مولانا کو اپنے کاموں میں بہت مستعد پایا، سفر سے پہلے

جس علاقہ میں بھیجتے وہاں کے پرانے چندہ دہندگان کی فہرست تیار کرواتے تاکہ پرانے لوگوں سے ملنے میں آسانی ہو، علاقہ کے اہم لوگوں کو خطوط دیتے تاکہ ان سے تعاون لیا جاسکے، دوران سفر کوئی ضرورت پیش آتی تو مولانا فوراً توجہ فرماتے اور جو بھی مشکل ہوتی اسے حل فرماتے، جو ضرورت ہوتی اسے مہیا فرماتے"

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء :

لکھنؤ میں اسوقت کوئی آفسیٹ پریس نہیں تھا، کانپور "آفسیٹ پریس" کے رمزی صاحب نے کوئی نئی ٹیکنک فلم کے بجائے کاغذ پر نگیٹیو بناکر آفسیٹ سے طباعت کرنے کی ایجاد کی تھی اس لئے دار العلوم کی عربی درسیات خصوصاً "قصص النبین" اور "القراۃ الراشدہ" کی طباعت برسوں کانپور کے اسی آفسیٹ پریس میں ہوتی رہی اور اس کے لئے والد صاحب ہی سفر کرتے رہے۔

حضرت مولانا کی ندوہ کی درسیات میں شامل کتاب "قصص النبیین" جب پہلی بار غالباً مصر میں چھپی تو اس میں بہت سی غلطیاں تھی، اس کو جب "مکتبہ دار العلوم" کی طرف سے چھپوانے کا فیصلہ ہوا تو اس کی تصحیح وپروف ریڈنگ اور طباعت واشاعت کے لئے لکھنؤ سے کانپور تک (جہاں "آفسیٹ پریس" میں یہ کتاب چھپ رہی تھی) جو دوڑ بھاگ کی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔

حضرت مولانا مدظلہ کی "مکتبہ دار العلوم" سے شائع ہونے والی پہلی اردو کتاب "تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی" کی کتابت وطباعت کے لئے کیا کیا مرحلے طے کئے اور کیسے کیسے پاپڑ بیلے، پھر کتاب کی اشاعت کے بعد جب صاحب تذکرہ کے پوتے "مولانا شاہ احمد الرحمان صاحب عرف محمد میاں گنج مراد آبادی" نے اپنے رسالے "تبصرہ بر تردید تذکرہ" میں حضرت مولانا

مدظلہ پر کیچڑ اچھالا تو والد صاحب اسے برداشت نہ کرسکے، اور ان کی اس تحریر پر ان کا مواخذہ کیا، جو اتفاق سے والد صاحب کے ہم سبق بھی رہ چکے تھے؛ دس بارہ صفحہ کی یہ تحریر پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو حضرت مولانا سے کتنی محبت وعقیدت تھی، اور حضرت مولانا مدظلہ کا روپے پیسے سے استغناء کا کیا عالم رہتا ہے، والد صاحب نے تحریر کیا ہے کہ حضرت مولانا مدظلہ نے کتاب کی رائلٹی تو دور کی بات ہے کتاب کا ایک نسخہ بھی "مکتبہ دارالعلوم" سے بطور "ہدیہ" قبول نہیں فرمایا، یہی نہیں بلکہ مکتبہ سے جو نسخے خریدے ان پر کسی قسم کا کوئی کمیشن بھی لینا گوارہ نہ کیا، اور کتاب کی ساری آمدنی "رواق رحمانی" کی تعمیر کے لئے وقف کردی۔

حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" کے پاکستانی ایڈیشن کی طباعت واشاعت کے لئے والد صاحب نے بڑی محنت، لگن اور خلوص سے کام کیا اور دیگر مفوضہ کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے، حضرت مولانا علی میاں مدظلہ اور مولانا معین اللہ صاحب ندوی کے شکریہ اور قدردانی کے خطوط اس کے گواہ ہیں۔

جب والد صاحب نے "قصبہ کوڑا تاریخ وشخصیات" مکمل کی اور اس کا ایک نسخہ ندوہ کے مہمان خانہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت مولانا نے فرمایا اسے اطمینان سے رائے بریلی میں پڑھوں گا، جب حضرت مولانا دوبارہ ندوہ تشریف لائے تو والد صاحب سے فرمایا کہ آپ نے یہ کتاب لکھ ڈالی اور مجھے خبر تک نہ دی، اب آپ اسی طرح تاریخ "کڑا" لکھدیں، انھوں نے حضرت مولانا کی فرمائش بسروچشم قبول کی، مجھے حضرت مولانا کی اس فرمائش کا علم نہیں تھا اس لئے مذکورہ کتاب مکمل ہونے کے بعد میرا تقاضہ تھا کہ اب آپ خاندانی فارسی مخطوطہ "سیر سالاری" کا اردو زبان میں جلد از جلد ترجمہ و تلخیص بھی کردیں تاکہ اس کو بھی شائع کردیا جائے،

انھوں نے میرے اس تقاضہ کو بھی فراموش نہیں کیا اور دونوں کام بیک وقت شروع کردیئے، ندوہ والے مکان میں رہتے تو تاریخ "کڑا" پر کام کرتے اور "ندوی منزل" میں ہوتے تو "سیر سالاری" پر کام کرتے، لیکن اللہ تعالی کو یہ دونوں کام ان کے ہاتھوں مکمل ہونا منظور نہ تھے، چنانچہ ان کا وقت موعود آگیا اور وہ جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ واکرم نزلہ

والد صاحب نے مجھے ۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ایک خط لکھنا شروع کیا تھا جو نامکمل ہی رہا اور مجھے ان کے ضروری کاغذات میں دستیاب ہوا، اس میں اور باتوں کے علاوہ دادا مرحوم مولانا سید محمد عبدالحیؒ پر لکھے ہوئے مضمون کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"چاہے اس کی دس ہی کاپیاں (کمپیوٹر) پرنٹر سے نکالی جائیں، طبع کرانے کی ضرورت نہیں، ایک نسخہ ندوہ کے کتب خانہ میں ایک نسخہ دیوبند کے کتب خانہ میں چلاجائے، ..... ہاں ایک نسخہ حضرت مولانا اور ایک نسخہ مولانا معین اللہ صاحب کو دیا جائے"

آخر میں اقتدار علی صاحب انجینیئر کے انتقال کی خبر ہے، والد صاحب کو مرحوم سے بڑا تعلق تھا، کیونکہ ندوہ کی اکثر عمارتوں کے نقشے ان ہی کی کاوش کے مرہونِ منت ہیں، خط کا آخری جملہ یہ تھا " کل رات میں اقتدار علی صاحب انجینیئر کا بھی انتقال ہوگیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے"

" اے اللہ دوسرے کے لئے دعاء مغفرت کرنے والا اب تیرے حضور پہنچ گیا ہے، اب وہ تیرے رحم وکرم کا محتاج ہے، اے اللہ تو اس پر اپنا خاص فضل وکرم فرما، اس کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر فرما، اور اس کو جنت الفردوس میں جگہ دے" (آمین)

تعمیر حیات:

نومبر ۱۹۶۲ء میں شعبہ تعمیر و ترقی سے رابطہ و تعارف عمومی کے لئے اردو کا رسالہ پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کا اجراء عمل میں آیا، اور ۱۹۷۳ء تک دس سال کے عرصہ میں دوبار ایسا ہوا کہ مسلسل خسارہ میں جانے کی وجہ سے ندوہ کے بعض ذمہ داروں نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ سے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کرالیا، لیکن جب والد صاحب نے حضرت مولانا مدظلہ کو اس کی اہمیت وافادیت بتائی، اور فرمایا کہ لوگ تعارف و پروپگنڈے کے لئے بہت روپیہ خرچ کرتے ہیں، آپ یہ سمجھ لیں کہ جو خسارہ ہورہا ہے وہ روپیہ ندوہ کے تعارف اور عوام سے رابطہ میں خرچ ہورہا ہے تو حضرت مولانا نے غور وفکر کے بعد دونوں بار اپنا فیصلہ بدل دیا اور "تعمیر حیات" جاری رکھنے کا حکم صادر فرمایا۔

مولانا محمد میاںؒ تعمیر حیات کے اجراء کے وقت ہی سے اس کے ایڈیٹر تھے اور تاحیات وہ اس کے ایڈیٹر رہے، لیکن چونکہ وہ ندوہ کے عربی ترجمان ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے بھی ایڈیٹر تھے اور عربی رسالہ ان کی زیادہ توجہ کا طالب تھا اس لئے والد صاحب برسوں عملی طور پر تعمیر حیات کی ایڈیٹنگ بھی کرتے رہے، البتہ اداریہ مولانا محمد میاںؒ ہی لکھتے تھے، مجھے خود اور میرے بھائیوں کو والد صاحب نے بارہا امین آباد مولانا محمد میاںؒ کے پاس اداریہ لینے کے لئے بھیجا ہے، برادر خورد عبدالجلیل ندوی سلمہ کا بیان ہے کہ ایک بار تعمیر حیات پریس جانے کے لئے تیار ہوچکا تھا صرف اداریہ لکھنا باقی تھا، والد صاحب نے ایک رقعہ لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ مولانا محمد میاںؒ کے گھر امین آباد جاکر ان سے اداریہ لے آؤ، مولانا غالباً اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس بار اداریہ نہیں لکھ سکے تھے اس لئے انھوں نے اسی رقعہ کی پشت پر اقبال کا یہ شعر لکھ کر میرے حوالہ کردیا ۔

کانپتا ہے دل تیرا اندیشہ طوفان سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

تعمیر حیات کی ایڈیٹنگ کے علاوہ والد صاحب تعمیر حیات میں ایک مستقل کالم "دارالعلوم کے حالات وکوائف" کے عنوان سے کافی عرصہ تک لکھتے رہے، جب شعبہ کا کام بہت بڑھ گیا تو یہ سلسلہ ان کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے بند ہوگیا۔

اس موقعہ پر میں یہ اعتراف کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہونے اور مضمون نگاری کرنے میں تعمیر حیات کا بڑا دخل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ والد صاحب کے تعمیر حیات سے تعلق ولگاؤ اور اس میں ان کے مضمون کی اشاعت کی وجہ سے میں تعمیر حیات بڑے ذوق شوق اور پابندی سے پڑھتا تھا، اس کے علاوہ تعمیر حیات کی ساری ڈاک اور تبادلے کے اخبارات ورسائل والد صاحب کے پاس ہی آتے تھے، میں ان رسائل وجرائد پر ایک نظر ضرور ڈالتا تھا، میں نے غالباً ۱۹۶۸ء میں اپنا پہلا مضمون اصلاح وترمیم کے لئے والد صاحب ہی کو دیا، دو تین مضمون دکھانے کے بعد میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگئی اور پھر میں ان کو دکھائے بغیر ہی اپنے مضمون ادھر ادھر مختلف رسائل کو بھیجنے لگا، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ مضمون نگاری کے میدان میں اصلاً میرا معلّم ومربّی تعمیر حیات ہی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

تعمیرات دارالعلوم ندوۃ العلماء:

شعبہ کے قیام سے پہلے ندوہ میں قابلِ ذکر عمارتیں صرف تین ہی تھیں، اسٹاف کوارٹر چار تھے اور ادنیٰ ملازمین کی بھی چند جھونپڑیاں تھیں۔
بڑی عمارتوں میں مسجد دارالعلوم، شبلی ہاسٹل (۱۹۵۸ء کے ابتدائی مہینوں

میں رحمانی ہاسٹل کی تعمیر ہوئی) اور دار العلوم کی اصل عمارت تھی، جس کے آدھے حصہ میں عربی درجات، دفتر اور آدھے حصہ میں چھوٹے طلباء کی رہائش تھی، موجودہ معہد دار العلوم مکتب کے نام سے صرف درجہ چہارم تک تھا اور اس کے درجات موسم کے اعتبار سے دار العلوم کی مختلف گیلریوں میں لگتے تھے، میں نے خود بھی درجہ چہارم تک ان ہی گیلریوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اسٹاف کوارٹر میں صرف چار مکان تھے، مہتمم صاحب کا مکان، اس سے متصل مولانا اویس صاحب ندویؒ (سابق شیخ التفسیر) کا مکان اور مولانا عبد الماجد ندوی کا مکان (ان کے اہل خانہ جب چند ماہ کے لئے اپنے وطن بہار چلے گئے تو کچھ عرصہ کے لئے ہم لوگ آکر اس گھر میں رہے تھے) اسی سے متصل منتظم مطبخ (منشی سعید صاحب) کا مکان تھا، ۱۹۶۰ء کے تاریخی سیلاب میں جب مطبخ کی کھپریل کی عمارت زمین بوس ہوگئی اور مطبخ کو موجودہ جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا تو مطبخ کے ایک حصہ میں مطبخ بنایا گیا اور ایک حصہ میں والد صاحب کے لئے مکان بنوایا گیا، جب مطبخ اپنی موجودہ جگہ منتقل ہوگیا تو اس میں ماسٹر منظور صاحبؒ (والد گرامی جناب محمد ہارون اندوری ندوی) رہنے لگے۔ تقریباً دس سال کے بعد جب ۱۹۷۰ء میں گومتی میں ایک بار پھر زبردست سیلاب آیا تو یہ مکان بھی زمین بوس ہوگیا، اور دار العلوم کی زمین کا ایک بڑا رقبہ (جس میں یہ مکان بھی تھا) حکومت نے بند بنانے کے لئے لے لیا، اس سیلاب کے بعد ہم لوگ موجودہ گھر میں منتقل ہوگئے، گویا یہ مکان ۲۵ سال سے ہم لوگوں کا ہمدم ودمساز ہے۔

شعبہ کے قیام کے بعد سب سے پہلے ۱۹۵۸ء میں وہ تین مکانات بنے جس میں والد صاحب، مولانا مرتضی صاحب مرحوم رہائش پذیر تھے اور مولانا برہان الدین صاحب کی سکونت ہے، کئی سالوں کے بعد مولانا عبد الماجد ندویؒ

کے لئے چوتھے مکان کا اضافہ کیا گیا جس میں اسوقت مولانا معین اللہ صاحب (نائب ناظم ندوۃ العلماء وناظر شعبہ تعمیر وترقی) رہائش پذیر ہیں، اس کے بعد یکے بعد دیگرے مختلف عمارتوں اور مکانوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوگیا، وہ سلیمانیہ ہاسٹل ہو یا اطہر ہاسٹل، مطبخ ہو یا معہد، تحفیظ القرآن ہو یا اسٹاف کوارٹرز، مسجد کی توسیع ہو یا مہمان خانہ کی توسیع غرض یہ کہ دار العلوم کی ہر عمارت کی تعمیر میں والد صاحب کا خلوص اور ان کا خون جگر بھی شامل ہے۔

شعبہ کے قیام کے بعد بڑی عمارتوں میں سب سے پہلے سلیمانیہ ہاسٹل کی تعمیر (غالباً ۱۹۶۳ء میں) ہوئی، والد صاحب کے لئے بڑی عمارت بنوانے کا یہ پہلا موقع اور تجربہ تھا اس لئے انھوں نے اس کی تعمیر میں بنفس نفیس بہت زیادہ دوڑ بھاگ کی، مورنگ کی خریداری کے لئے خود ہی کالپی گئے اور معاملہ طے کر کے مورنگ کا پہلا ٹرک اپنے ساتھ ندوہ میں لائے، اسی طرح دروازوں اور کھڑکیوں کے لئے ساکھو کی لکڑی کی تلاش وخریداری کے لئے نیپال کی ترائی تک گئے اور لکڑی کی پہلی قسط اپنے ساتھ لائے، ایک بڑھئی کو ندوہ کے احاطہ کے اندر رکھا اور اس سے تمام کھڑکیاں اور دروازے بنوائے، جب سلیمانیہ ہال کی ضخیم چھت ڈالی گئی تو خود موقع پر صبح سے شام تک موجود رہے، (تماشائی کی حیثیت سے میں بھی موجود تھا) اس کی چھت ڈالنے میں تقریباً سو مزدور لگے تھے، مغرب کے بعد جب کام ختم ہوا تو تنہا خود ہی مزدوروں کو مزدوری دیتے رہے اور ان سے دستخط کرواتے یا انگوٹھا لگواتے رہے، اسی طرح جب ۱۹۷۰ء میں دار الطعام (ڈائننگ ہال) کی چھت ڈالی گئی تو نگرانی کے لئے موقع پر خود موجود رہے۔ تعمیراتی کاموں میں جناب اظہر علی مرحوم (والد گرامی جناب قمر علی ندوی صاحب مقیم دبئی) پھر چودھری غلام رسول صاحب اور مالیات کی فراہمی میں مولانا عبد الرشید ندوی مرحوم اور مولانا محمد ہاشم ندوی مرحوم والد صاحب کے دست وبازو بنے رہے، ان تمام حضرات کی خدمات ناقابل فراموش

ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے، اور ان حضرات کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

ندوہ کے لئے اور خصوصاً شعبہ تعمیر ترقی اور اس کے ماتحت شعبوں کے لئے انھوں نے کتنی جد وجہد کی اور کس فکر مندی، اخلاص اور محنت سے بغیر کسی ستائش کی تمنا اور کسی صلہ کی پرواہ کئے بغیر کام کیا، اس موضوع پر مجھ سے بہتر ان کے ساتھ کام کرنے والے حضرات روشنی ڈال سکتے ہیں۔

ندوہ میں دیگر خدمات :

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ والد صاحب رجسٹرڈ حکیم، اور رجسٹرڈ ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی تھے، اور "آل انڈیا طبی کونسل" دہلی کے ممبر بھی تھے، کلکتہ میں تقریباً دو سال (۱۹۵۴ء- ۱۹۵۵ء) طبابت کرچکے تھے، ۱۹۵۶ء میں جب ندوہ میں تقرر ہوگیا جب بھی وہ اپنے اس فن سے اہل ندوہ کی خدمت کرتے رہے، ضرورتمندوں کو طبی نسخے لکھ کر دیا کرتے، گھر والوں کا علاج بھی یونانی ادویہ یا ہومیوپیتھک ادویہ سے کرتے، ندوہ میں چونکہ معاشی تنگی تھی اس لئے کئی بار بعض لوگوں نے شام کے وقت مطب کھولنے کی ترغیب بھی دی کہ آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے لیکن اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، ۱۹۵۸ء میں جب شعبہ کا قیام عمل میں آگیا تو ندوہ کے ذمہ داروں نے شعبہ ہی میں ہومیوپیتھک دواؤں کی ایک الماری رکھوا دی تاکہ ندوہ کا عملہ اور طلباء والد صاحب کے فن سے استفادہ کرسکیں، چنانچہ برسوں شعبہ کے کاموں کے علاوہ یہ اضافی خدمت بھی انجام دیتے رہے، ہر جمعہ کو ڈاکٹر اشتیاق صاحب قریشی نمازِ جمعہ کے بعد شعبہ ہی میں آکر بیٹھ جاتے والد صاحب بھی ان کے ساتھ ہوتے، جب مریض طلباء یا اسٹاف کے افراد کے آنے کا سلسلہ ختم ہوجاتا تو دونوں حضرات اٹھ جاتے، شعبہ کا کام جب بہت زیادہ پھیل گیا تو یہ دواخانہ

مولانا اسحاق صاحب ندوی سندیلوی سابق مہتمم و شیخ الحدیث (متوفی کراچی ستمبر ۱۹۹۵ء)
کے سپرد کردیا گیا۔

شعبہ تعمیر و ترقی کی اہم اور دقت طلب ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندوی مدظلہ (ناظم ندوۃ العلماء) کے ایماء پر سلیمانیہ ہاسٹل کی نگرانی کی ذمہ داری بھی سنبھالی، اور چھوٹے طلباء کی دیکھ بھال اور تربیت کرتے رہے، غالبا ۱۹۷۸ء میں بڑے اصرار کے بعد ان کا اس خدمت سے استعفاء منظور کیا گیا۔

ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ والد صاحب ندوہ سے ملحق دوسرے شہروں میں واقع بعض مدارس کے نگراں بھی تھے اور وقتاً فوقتاً سفر بھی کرتے رہتے تھے، انھوں نے آخری سفر وفات سے کچھ عرصہ قبل بذریعہ جیپ کالپی، اُرئی، ممتاز آباد، اور گلولی کا کیا تھا، ان کی نگرانی اور ندوہ سے ملحقہ مدارس کے سفر کے بارے میں کچھ تفصیل آپ کو مولانا شفیق الرحمان ندوی اور مولانا حسب اللہ صاحب ندوی کے مضمون سے معلوم ہوجائے گی۔

جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور کی خدمات:

۱۹۷۱ء میں جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور کے اعزازی جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اس ادارہ نے تقسیم ہند سے پہلے غیر مسلموں میں بڑا کام کیا ہے، سیکڑوں ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا، ۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء میں نو مسلم خاندانوں کے ۱۷ لڑکوں کو ندوہ میں تعلیم کے لئے داخل کیا، ان کی خصوصی تربیت کے لئے مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کو مقرر کیا گیا تھا۔ دینی کتابوں کو ہندی زبان میں منتقل کرنے کی ابتداء کرنے کا سہرا اسی ادارے کے سر ہے، قابلِ ذکر کتابوں میں رحمۃ للعالمین (قاضی محمد سلیمان منصور پوری) کا ہندی ترجمہ، قرآن کا تعارف"

قران امرت " کے نام سے اور ترجمان القرآن (مولانا ابو الکلام آزاد) کا ہندی ترجمہ (سرمایہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں ہوسکا) رحمت عالم (سید سلیمان ندوی) کا انگریزی ترجمہ والد صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ پروفیسر محمد سمیع صدیقیؒ (سابق پرنسپل ممتاز ڈگری کالج لکھنو) سے کروایا تھا لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے شائع نہیں کراسکے تو اسے خود مترجم نے اپنے طور پر شائع کرایا، کافی عرصہ کے بعد اس کا ہندی ترجمہ مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب برنی (مقیم مدینہ منورہ) کی سعی وکاوش سے جمعیۃ کی طرف سے شائع ہوا، ان اہم کتابوں کے علاوہ والد صاحب کے جنرل سکریٹری بننے سے پہلے جمعیۃ کی طرف سے اردو ہندی اور انگریزی زبان کی جو کتابیں شائع ہوچکی تھیں ان کے نام حسب ذیل ہیں :

اردو کتابیں :

۱ - یازدہ سورہ (عربی وہندی رسم الخط مع اردو وہندی ترجمہ) مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۲ - سیرت خلیل وکتاب جلیل از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۳ - نوائے نیرنگ (اردو) سید غلام بھیک نیرنگؒ

۴ - اسلامی عقیدے از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۵ - نماز کیسے پڑھیں از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۶ - مسلم کا کفن دفن از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۷ - نماز پنجگانہ کی اہمیت از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۸ - ضرورت کے چند مسائل از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۹ - مسلمان بزدل نہیں ہوسکتا از مولانا ابولکلام آزادؒ

ہندی کتابیں :

۱ ۔ رحمۃ للعالمین (حصہ اول) از قاضی محمد سلیمان منصور پوری ترجمہ قاضی عابد علی بلھوری

۲ ۔ قران امرت از مولوی ناصر علیؒ (سابق ستیہ دیو)

۳ ۔ یازدہ سورہ (عربی وہندی رسم الخط مع اردو وہندی ترجمہ) مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۴ ۔ اسلام مت کے عقیدے از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۵ ۔ کتاب الصلاۃ از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۶ ۔ مسلم کا کفن دفن از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۷ ۔ اردو ہندی پرائمر (اول ، دوم) از عابد علی بلھوری

۸ ۔ اسلام کا مہرشی از مولوی ناصر علیؒ (سابق ستیہ دیو)

انگریزی کتابیں :

۱ ۔ KITAB-US-SALAT از محمد محی الدینؒ (مع عربی وانگریزی متن)

۲ ۔ ISLAMS ACHIVEMENTS از پروفیسر محمد سمیع صدیقیؒ

والد صاحب نے جمعیۃ کی طرف سے درج ذیل کتابیں شائع کرائیں، پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن اس کے علاوہ ہیں، مطبوعات کے نام یہ ہیں :

اردو کتابیں :

۱ ۔ آج کا مسلمان ایک سوال ؟ از صفیہ خاتون (ریاض)

۲ ۔ اسلام اور چھوت چھات از قاضی عابد علی بلھوری

۳ ۔ تمام اقوام عالم کو دعوت فکر از مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب

۴ ۔ اسلام کا نظام زکوٰۃ از مولانا ابوالکلام آزادؒ

۵ ۔ مسائل رمضان وزکوٰۃ از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

۶۔ دعوت و تبلیغ، مسلمانوں کا ایک بھولا ہوا سبق
از مولانا سید محمد عبدالحیؒ
۷۔ بابری مسجد یا رام جنم بھومی از مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ
۸۔ ارکان حج از مولانا سید محمد عبدالحیؒ
۹۔ مشعل راہ از مولانا محمد خالد فیصل ندوی
۱۰۔ پیغمبر توحید بابل کی عدالت میں از مولانا بہلول خاں

ہندی کتابیں :

۱۔ رحمت عالم از سید سلیمان ندوی مترجمہ حبیب اللہ اعظمی صاحب
۲۔ مسائل عیدالاضحی وقربانی از مولانا سید محمد عبدالحیؒ
۳۔ آج کا مسلمان ایک پرشن ؟ از صفیہ خاتون (ریاض)
مترجمہ عبداللطیف صاحب
۴۔ اسلام اور چھوا - چھوت از قاضی عابد علی بلہوری
۵۔ اوشیک سوچ وچار از مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب (مدینہ منورہ)
مترجمہ حبیب اللہ اعظمی صاحب
۶۔ واستوک سوتنترتا اسلام میں از مولانا ابوالکلام آزادؒ
۷۔ مسائل رمضان وزکوٰۃ، روزہ، تراویح، اعتکاف، عیدالفطر
از مولانا سید محمد عبدالحیؒ
۸۔ رسول اکرم از سید سلیمان ندوی مترجمہ محمد ولی اللہ ایم - اے
۹۔ مہاتو پورن سندیش از مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب
۱۰۔ ایکتا کا پیامی از سید سلیمان ندوی

انگریزی کتابیں :

۱۔ A CALL TO THINK از مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب

۲۔ AL-QURAN AND SOCIAL REFORM

از پروفیسر محمد سمیع صدیقیؒ (سابق پرنسپل)

۳۔ سرور عالم مترجمہ سید سلیمان ندوی

۴۔ اسلامی عقیدے از مولانا سید محمد عبدالحیؒ

مترجمہ معین الدین بی - اے

ماہنامہ " محکمات " لکھنؤ:

۱۹۷۴ء میں والد صاحب نے جمعیۃ کی طرف سے دعوتی و تبلیغی مقاصد کے پیش نظر ماہنامہ " محکمات " کا اجراء کرایا پانچ چھ ماہ یہ رسالہ کانپور سے شائع ہوتا رہا، اور میں اس کو چھپوانے اور اس کی پوسٹنگ کرنے لکھنؤ سے کانپور جاتا رہا، اس طرح مصارف بھی زیادہ ہوتے اور پریشانی بھی ہوتی اس لئے بعد میں والد صاحب نے اس کا ڈکلریشن لکھنؤ سے کرالیا، وہ وفات تک اس کے ایڈیٹر رہے، متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا اور خود بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ندوہ میں طالب علمی کے زمانہ میں ایک قلمی ماہنامہ " نقاش " کے نام سے نکالتے تھے اس کا ایک شمارہ میں نے کچھ عرصہ پہلے طلباء دارالعلوم ندوۃ العلماء کی انجمن "جمعیۃ الاصلاح " کی لائبریری میں دیکھا تھا ممکن ہے وہاں اب بھی موجود ہو۔

بقول مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری " قدرت نے مولانا کو ادب و تاریخ کا بڑا ستھرا ذوق عطا کیا تھا، تحریر بڑی شگفتہ، معلومات خیز اور زبان وبیان کا بانکپن لئے ہوئے ہوتی تھی، ایک عرصہ تک "محکمات "کے مدیر اعلیٰ رہے، ..... "محکمات" کے شذرات مختصر مگر جامع ہوتے"

والد صاحب شعر و ادب کا ستھرا اور اعلیٰ ذوق بھی رکھتے تھے، کچھ عرصہ ادبی مضامین بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے، اپنے تاریخی نام فروغ احمد کے پہلے جزء فروغ کو بطور تخلص استعمال کرتے تھے، ماہنامہ "محکمات" کے لئے آنیوالی بعض نظموں میں میں نے خود ان کی ترمیم و اصلاح دیکھی ہے۔

جناب حکیم شمس الحسن صاحب" بھوپال کے نام ایک خط کے بعض اقتباسات سے آپ کو ان کے ادبی و شعری ذوق کا کچھ اندازہ ہوگا، اس میں ادب کی چاشنی بھی ہے، آخرت کی فکر بھی ہے اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہے انجام بخیر ہونے کی دعاء بھی ہے، تحریر کرتے ہیں :

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

طالب علمی کے زمانہ میں یہ شعر بہت پڑھا کرتا تھا، یہ تو پوری غزل ہے ۔

اسیران قفس ، نغمہ سرا ہونے کا وقت آیا
وہ موت آئی وہ ہستی سے رہا ہونے کا وقت آیا

خوب ہے ؟ کس کا ہے یہ شعر ؟ لیکن اس سے زیادہ پر اثر دوسرا شعر ہے ۔

لو مسیحا نے بھی، اللہ نے بھی یاد کیا
آج بیمار کی ہچکی بھی، قضا بھی آئی

خوب ہے صاحب خوب ماشاء اللہ آپ کو اشعار خوب یاد ہیں، بزرگان دین خوب خوب شعر پڑھتے اور لکھتے رہتے ہیں اچھا صاحب بڑھاپے میں بھی لکھتے پڑھتے ہیں، مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ کے ترتیب دئے ہوئے حضرت تھانوی" کے ملفوظات آجکل پیش نظر ہیں ایک صاحب سے مانگ لایا ہوں دوپہر کے بعد سے مطالعہ کر رہا ہوں جگر صاحب مراد آبادی مرحوم حضرت تھانوی کی

خدمت میں تشریف لے گئے تو حضرت تھانوی نے فرمایا " آپ کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے بار بار پڑھا کرتا ہوں اگر میں کسی شاعر کو شعر پر انعام دیتا تو اس شعر پر آپ کو سب سے بڑا انعام دیتا اب حضرت تھانوی نے جگر صاحب کا شعر انہی کو سنایا ۔

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

اس کے بعد جگر صاحب نے حضرت تھانویؒ کو اپنے یہ تین شعر سنائے ۔

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں
پھیکی شب مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں
ساقی نے جو دیا تھا بصد عرض تمنا
وہ جرعہ بھی زہر آب ہے معلوم نہیں کیوں
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

راقم الحروف فروغ تخلص کرتا تھا، میرے درجہ کے ایک ساتھی فوق تخلص کرتے تھے (ایک دن) ساڑھے تین بجے سہ پہر کو دونوں درجہ سے نکلے ایک شعر میری زبان سے نکلا، فوق صاحب نے اس کا جواب دیا اور پھر سبزہ پر بیٹھ گئے، طلبہ کا ہجوم ہوگیا مضامین کے اعتبار سے اشعار کا تبادلہ شروع ہوگیا، عصر کی نماز گئی تو گئی مغرب کا وقت ہوگیا تب اٹھے، مگر اب کیا ہے ...... ۔

نہا دھو کر نئے کپڑے بدل کر چار کے کاندھے
بڑی دھوم سے نکلا ہے جنازہ تیرے دیوانے کا
پڑا ہے پھیر میں تسبیح کے اے زاہد ناداں
حساب ایک دن تجھے دینا پڑے گا دانے دانے کا

ثاقب صاحب مرحوم کانپوری آخر میں بہت معذور ہوگئے تھے ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا جس کی وجہ سے کھانا بھی وہ خود نہیں کھاسکتے تھے ان کے گھر والے نوالہ بنا کر ان کے منھ میں رکھتے تھے ایک دن یہ منظر میں نے دیکھا تو کسی شاعر کا یہ شعر یاد آیا۔

ان ہاتھوں کے رعشہ کا بوقت پیری
مفہوم یہ ہے کہ زادِ سفر کچھ بھی نہیں

خواجہ عزیزالحسن مجذوب حضرت تھانویؒ کے دست گرفتہ تھے "انجمن بہار ادب" کا قیصر باغ بارہ دری میں مشاعرہ تھا، تشریف لائے، شعر ارشاد فرمایا۔

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
پیاسا کوئی رہ جائے نہ بالائے زمیں ساقی

حاضرین جلسہ متوجہ ہوئے خوب خوب داد ملی، مگر ذیل کے شعر نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

زبردستی لگادی آج بوتل منہ سے ساقی نے
میں کہتا ہی رہا، ہاں ہاں، نہیں ساقی نہیں ساقی

سفید داڑھی، شیروانی پہنے، دوپلّی ٹوپی لگائے، لہجے میں قدرتی ارتعاش، اس پر یہ مصرعہ۔

میں کہتا ہی رہا، ہاں ہاں، نہیں ساقی نہیں ساقی

(پھر) مجلس برخاست ہوگئی۔

اسلامیہ کالج لال باغ میں کوئی فنکشن تھا ساتھ میں مشاعرہ بھی، طلبہ کے گروپ پہونچنے لگے جگر صاحب تشریف لائے مطلع سنایا۔

شعر والہام تو کیا عرش بھی نازل ہوجائے
یہ دل جو ایک شئے ہے حقیقت میں اگر دل ہوجائے

یہ شعر اس دور کا ہے جب وہ تائب نہیں ہوئے تھے، کیا حقیقت بیان کی ہے پورے تصوف کا خلاصہ ہے

یہ دل جو ایک شئے ہے حقیقت میں اگر دل ہوجائے

کیا ٹھیک ہے صاحب ؟ حضرات صوفیا پر ممکن ہے عرش بھی نازل ہوتا ہو ہم جیسے بے بصروں اور بے خبروں کو کیا خبر۔

اخبارات میں خبر شائع ہوگئی کہ جگر صاحب کا انتقال ہوگیا غالبا ۳۸ء کی بات ہے دارالعلوم (ندوۃ العلماء لکھنو) کے طلبہ نے تعزیتی جلسہ کیا، ایک عدد تقریر راقم سطور کی بھی تھی، شروع کی ہے

اٹھ گیا کیا جگر ذروبہ دل شعلہ بہ جاں
درو دیوار سے ماتم کی صدا آتی ہے

ان کے لئے یہاں قرآن خوانی ہوئی رات ۸/۳۰ بجے آل انڈیا ریڈیو سے خبر ملی کہ جگر صاحب بقید حیات ہیں، جامعہ ملیہ دہلی میں مقیم ہیں۔

اچھا صاحب یہ تو سب ہوگیا، اب حال بتائیے، کس حال میں ہیں، طبعیت کچھ سنبھل گئی ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست رکھے، امن وعافیت سے رکھے۔

اللہ تعالیٰ عافیت محمود، انجام محمود فرمائے، اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات آسان فرمائے، اللہ تعالیٰ آپ کے خلوص ، آپ کی محبت، دین کے لئے آپ کی محنت ومشقت کا بھرپور صلہ دے، ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین باد ہے

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

یہ طول بیانی صرف اس لئے ہوگئی کہ آپ نے چھیڑ دیا ہے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

یادیں ہی یادیں، مگر ان کا حاصل کیا؟ وہاں کا دھڑکا چین نہیں لینے دیتا، ایک بے مایہ کو دعاؤں کا سہارا دیدیجئے گا"

والسلام مع الاکرام
محمد عبدالسمیع ندوی

دعوتی و تبلیغی خدمات:

دعوتی و تبلیغی خدمات وہ بیک وقت دونوں اداروں (ندوہ اور جمعیۃ) کی طرف سے اور ذاتی طور پر بھی انجام دیتے تھے، ان کے نام آمدہ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مسلم غیر مسلم لوگ خط کے ذریعہ ان سے رابطہ رکھتے تھے اور اسلام پر ہندی لٹریچر اور ہندی ترجمہ قرآن کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، وہ ان کی رہنمائی بھی کرتے اور حسب ضرورت ان کو کتابیں بھی مہیا کرتے اور ہندی ترجمہ قرآن بھی ارسال کرتے، ان ہی خطوط میں ایک رجسٹری کے اکنالجمنٹ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے شیوسینا کے چیف "بال ٹھاکرے" کو ۱۹ جنوری ۱۹۷۳ء کو ایک خط بعض دعوتی اور تبلیغی کتابوں کے ساتھ روانہ کیا تھا، یہی نہیں بلکہ دسیوں افراد ان کے ذریعے مسلمان بھی ہوئے، خود والد صاحب کے ہاتھ پر دو غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا، ان میں سے ایک بینک کا ملازم تھا اور دوسرا تاجر تھا، متعدد نو مسلم افراد کی مالی واخلاقی سرپرستی بھی کی، اس کے علاوہ دعوت و تبلیغ سے متعلق مختلف اداروں اور مدرسوں سے ان کا مسلسل رابطہ تھا، پیش آمدہ مسائل میں وہ والد صاحب سے مشورہ بھی طلب کرتے، والد صاحب ان کو جواب دیتے اور ان کا ہر طرح سے تعاون کرتے، نمونہ کے طور پر دعوت و تبلیغ سے متعلق چند خطوط کے بعض اقتباسات حاضر خدمت ہیں:

خط نمبر ۱:

۷/۴/۱۹۸۳ء

حضرت مولانا صاحب ،، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

" ..... محترم ومکرم بھائی صاحب آپکی بہت مہربانی ہے کہ آپ مجھے کتابیں بھیجتے ہیں اور آپ یقین کریں میں ہر ایک کتاب کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں اور بار بار غور سے مطالعہ کرتا ہوں۔ میں ہر سانس سے " اللہ ہو" کا ذکر بھی کرتا ہوں اور روزانہ قرآن مجید بھی پڑھتا ہوں اور ہر لفظ پر غور وفکر بھی کرتا ہوں ۔ میں یہاں بھی MUNICPAL LIBRARY کا ممبر بنا ہوں۔ یہاں میں اسلام کو سمجھنے اس پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے اس علاقہ میں کوئی اچھا عالم نہیں ملا ہے مجھے علم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس وقت اللہ کے فضل وکرم سے میں کتابیں بھی خرید سکتا ہوں ..... آپ مجھے قریب دس کتابوں کے نام وپتے لکھیں میں خرید لوں گا اس سے اردو بھی اچھی طرح آجائیگی اور اسلام کی بھی تعلیم مل جائیگی میں آپ کو اپنا بھائی سمجھ کر لکھ رہا ہوں کہ آپ مجھے اچھی اچھی کتابیں بتائیں میں خرید لونگا، ..... یا حدیثیں وغیرہ جو اچھی اردو میں کسی اچھے عالم کا ترجمہ کیا ہو منگوادیں تو آپکی مہربانی ہوگی اور آپ میرے لئے دعاء کریں خداوند کریم مجھے علم اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے، .....۔ خاکسار

KEWALANAND GIRI

کیول نند گری صاحب سے والد مرحوم کی کافی عرصہ تک خط وکتابت رہی، بہت ممکن ہے یہ مسلمان بھی ہوگئے ہوں لیکن مصلحتاً خطوط میں اپنا اسلامی

نام نہ لکھتے ہوں، انھوں نے والد صاحب سے انگریزی ترجمہ قرآن کی بھی فرمائش کی تھی جو اسوقت ہندوستان میں دستیاب نہ تھا، عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ تاج کمپنی پاکستان میں چھپا تھا جو کسی مکتبہ سے ۱۵۰ روپئے کا دستیاب ہوا تھا وہی والد صاحب نے مکتبہ سے خرید کر ان کو روانہ کردیا تھا۔

خط نمبر ۲:

مکرمی سلام مسنون !

" والا نامہ آیا ..... بوڑھا پنڈت بسن اپادھیا (نام واضح نہیں ہے) کا انتقال ہوگیا، میرے سامنے انھوں نے کلمہ طیب پڑھا لیکن بجبوری احقر نے خاموشی ہی کو بہتر جانا اور ان کو بہت تسلی ودلاسہ دیا، کسی اور کو اس کی اس بات سے آگاہ کرنا مناسب نہ جانا..... "

والسلام احقر محمد ذکی عفی عنہ ۲/۲۱/ ۱۹۸۹ء

خط نمبر ۳:

یہ خط جناب حکیم شمس الحسن صاحب بھوپال کے نام ہے جس سے والد صاحب کی بعض دینی، دعوتی، تبلیغی خدمات پر کچھ روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ ہو :

۱۹ نومبر ۱۹۹۱ء

محترم المقام زید کرمکم ! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۳ نومبر سے ۱۶ نومبر تک تقریباً سفر پر رہا، درمیان میں تین چار روز کے لئے لکھنؤ آیا تھا، اس کے بعد پھر چلاگیا، اور اب جمعہ کو پھر کانپور جارہا ہوں۔

ہمیر پور میں ایک صاحب جز وقتی طریقہ سے دعوت وتبلیغ کا کام کررہے ہیں، ہمیر پور ضلع کے مختلف مواضعات کا انھوں نے دورہ کیا تھا ایک دیہات میں ارتداد کا بھی مسئلہ تھا، انھوں نے

وہاں بھی کام کیا اور اپنی حکمت عملی سے مرتد ہونے والے گھرانے کو پھر دائرہ اسلام میں لے لیا ، کئی رپورٹیں انھوں نے بھیجی تھیں مگر علالت کی وجہ سے چونکہ ناقابل سفر تھا اس لئے نہیں گیا۔

۶ نومبر کو پہونچا حالات معلوم کئے کام کو مستحکم کرنے کے لئے بعض احباب سے اخلاقی تعاون کی درخواست کی ، ان صاحب کو مزید ہدایات دے کر چلا آیا۔ ..... آج کا مسلمان اردو، ہندی ۲۵ ، ۲۵ عدد روانہ کررہا ہوں۔ والسلام مع الاکرام

محمد عبدالسمیع ندوی

بیعت وارادت :

والد صاحب مولانا محمد شفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی مقیم رباط " آغاالماس " مکہ مکرمہ سے بیعت تھے، جو حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور ان کے خلیفہ تھے، والد صاحب اپنے شیخ کے بتائے ہوئے معمولات کے پابند اور سحر خیز تھے، پیر و مرشد کی حیات (۱۹۳۸ء) تک ان سے خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ قائم رکھا۔

میں خود والد صاحب کی ہدایت پر ایک بار غالباً ۱۹۷۸ء میں رباط آغا الماس گیا تھا (جو حرم مکی کے توسیعی حصہ کی طرف تھی اب اس کا کوئی نام ونشان باقی نہیں) تاکہ ان کے اہل خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرسکوں لیکن مجھے وہاں ان کا کوئی شناسا نہیں ملا تو میں واپس آگیا۔ مولانا شفیع الدین مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے خطوط دادا مرحوم کے نام آئے ہوئے میرے پاس محفوظ ہیں البتہ والد صاحب کے نام ان کا کوئی خط میری نگاہ سے نہیں گذرا، ممکن ہے سارے خطوط کو توجہ سے دیکھا جائے تو بعض خطوط ان میں والد صاحب کے نام بھی نکل آئیں۔ محمد امین محمد صدیق میمنی صاحب

مقیم مکہ مکرمہ کے ہاتھ کا ایک خط ۱۲ رمضان ۱۳۹۵ھ کا لکھا ہوا والد صاحب کے کاغذات میں ملا ہے جس سے دونوں کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے، اور والد صاحب کے تعلق مع اللہ اور کثرت سے اوراد ووظائف پڑھنے کا معمول معلوم ہوتا ہے، یہ بزرگ کون ہیں؟ ان کے بارے میں کوئی تفصیل معلوم نہیں، حالانکہ والد صاحب کی ہدایت پر میں نے (غالباً ۱۹۷۸ء میں) مکہ مکرمہ میں ان کے گھر جاکر ان سے ملاقات بھی کی تھی، میری ان کی کیا گفتگو ہوئی اسوقت کچھ ذہن میں نہیں ہے، والد صاحب کی وفات کے بعد میں نے ان کو ایک خط بھی لکھا تھا جو "غیر معروف" کے نوٹ کے ساتھ میرے پاس واپس آگیا، وہ اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

مکہ مکرمہ، ۱۷/۹/۱۹۷۵ء

مکرمی ومحترمی مولانا محمد عبدالسمیع صاحب ندوی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محب نامہ رمضان شریف کی ابتداء ہی میں موصول ہوکر باعث سرفرازی ہوگیا، حسب معمول چونکہ ختم قرآن پاک میں مشغول ہوگیا اس لئے فوری طور پر جواب دینے سے قاصر رہا، لہذا معذرت خواہ ہوں، بفضلہ تعالی پرسوں رات پہلا ختم تو نصیب ہوگیا، یہ بھی اللہ تعالی کا بے پایاں کرم اور ذرہ نوازی ہے کہ اس ضعف وناتوانی میں، غفلت وتساہلی پسندی کے عالم میں بھی اس مہبط الوحی کے پر انوار جوار میں روزآنہ تین تین پارہ تراویح میں خیر وخوبی کے ساتھ پڑھوادیئے۔ اللہ تعالی اپنی اس سراپا صداقت وعظمت آمیز کتاب کے انوار وتجلیات، افادات وبرکات سے آپ ہم سب کو زیادہ سے زیادہ نوازے، اور اس کی برکت سے لیلۃ القدر نصیب فرمادے کہ ہزار ماہ سے بہتر ہے ایک رات اس کی،
اسی مہینہ میں اللہ کا پیام آیا۔

اور جس پاک ذات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور صدقہ میں ہمیں دولت عظمیٰ نصیب ہوئی اسی کونین کے سرور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اور حقیقی غلامی کی نسبت نصیب ہو کیونکہ ساری دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا راز اسی شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے جس طرح کہ ارشاد ربانی ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی "

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے تمام معمولات جاری وساری ہوگئے، وہ تلاوت قرآن ہو یا حزب البحر یا دلائل الخیرات بس نہایت شوق وذوق اور یقین ووثوق کے ساتھ پابندی سے پڑھتے رہیں تو فی الحقیقت ساری زندگی کو منظم وبابرکت کرنے کے علاوہ انوار وانعامات غیبی کا موجب بھی بنتے ہیں ..... بہرحال اس یقین پر اکتفا اور قناعت کرتا ہوں کہ آپ تو ماشاء اللہ خوب خوب واقف کار ہیں، لیجئے سحری کی پہلی توپ ہوگئی، اب تک نیند کا دور دور تک نشان نہیں، یہ بھی اپنے مولا کا کس قدر کرم ہے ۔

ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

جو کیفیت آپ نے بیان فرمائی ہے وہ فی الحقیقت قابلِ صد شکر اور لائقِ صد رشک ہے " وھو معکم " خوب پڑھتے رہیں، اس قادر مطلق کی ذات کا جب اس طرح خوب خوب استحضار ہوجائے گا تو جسم وجان میں فرحت ولذت کی ایک لہر دوڑ جاتی رہے گی، گریہ بھی طاری رہے گا تو لذت آمیز انداز میں اس طرح کہ ۔

کبھی روپڑا ہمبسم کبھی اشک مسکرائے

..... اور آپ پر جو گریہ کی کیفیت طاری ہونے لگی ہے (.....)

اس پر تو یہ شعر یاد آگیا۔

تو ہو کسی بھی حال میں مولا سے لو لگائے جا

قدرت ذوالجلال میں کیا نہیں، گڑگڑائے جا

بہرحال آپ ہمت سے اور استغناء سے کام لیں تو انشاء اللہ یہ ترقی دن دونی رات چوگنی ثابت ہوگی، عید بھی مبارک کہ یہ صیام نہیں عید کا پیام آیا ہے۔ فقط

محمد امین

والد صاحب اپنے معمولات کے پابند اور سحر خیز تھے، تہجّد، تلاوتِ قرآن، اوراد ووظائف پابندی سے پڑھتے تھے، قرآن کریم کے شروع میں لکھے ہوئے ان کے ایک نوٹ سے معلوم ہوا کہ رمضان میں تین قرآن پاک ختم کرنے کا معمول تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ۱۹۸۸ء میں عمرہ اور زیارت مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت سے بھی بہرہ ور کیا۔

ازواج واعقاب :

والد مرحوم کی شادی ۱۹۴۷ء میں نویں صدی ہجری کے مشہور عالم مولانا سید الدینؒ (جو مولانا خواجگی کالپوی کے نام سے معروف ہیں) کے خاندان میں ہوئی، جن کا سلسلہ نسب سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر ختم ہوتا ہے، اپنے پیچھے چھ لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑیں، جن کی تفصیل یہ ہے :

ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز (مقیم کانپور) سید محمد عبدالرشید ندوی (مقیم ریاض) حافظ سید محمد عبدالجلیل ندوی (مقیم دبئی) سید محمد عبدالرحمٰن بی۔ اے (مقیم ندوہ، لکھنو) حافظ سید محمد عبید الرحمٰن ندوی بی۔ اے، (مقیم ندوہ، لکھنو) سید محمد عبدالحی ثانی (مقیم ندوہ، لکھنو) عامرہ خاتون (منسوب سید اشفاق احمد، رائے بریلی) شاہدہ خاتون، (منسوب سید نیاز احمد، فتحپور ہسوہ) رقیہ خاتون (منسوب سید ملک اشرف، بلرامپور ضلع گونڈہ) عارفہ خاتون (منسوب سید عقیل الرحمٰن، فتحپور ہسوہ)۔

اللهم اغفرله وارحمه واكرم نزله، وصلى الله على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه اجمعين

* * *

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

ہائے میرے دادا جان

عذراء خاتون (ریاض)

دل کو تڑپائے گی رہ رہ کے شفقت تیری
اشک برسیں گے جب یاد آئے گی الفت تیری
تجھے ڈھونڈیں کہاں اب، تجھے پائیں کہاں اب
اب تو خوابوں ہی میں آئے گی صورت تیری

وہ ۱۹۹۵ء کا آخری مہینہ، بدھ کا دن، اور ۲۷ تاریخ تھی (انڈیا میں ۲۸ ویں تاریخ شروع ہو چکی تھی) رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے، ابّی برآمدے میں بیٹھے کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہے تھے، میں اندر کمرے میں لائٹ آف کئے لیٹی ہوئی تھی، چھوٹے بھائی بہن سو چکے تھے اس لئے گھر میں ہر طرف سناٹا تھا، زہراء پاس ہی لیٹی تھی اور جاگ رہی تھی، میں اپنے خیالات میں گم تھی کہ یکایک فون کی بیل بجی اور نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، فون ابّی کے پاس ہی میز پہ رکھا ہوا تھا انھوں نے ریسیور اٹھایا، چونکہ گھر میں سناٹا تھا اس لئے ان کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی، ان کے ہیلو کے بعد مجھے جو آواز سنائی دی وہ یہ تھی:

اگر ضروری بات ہے تو بتائیں!

کس کا؟ یہ سن کر میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

اور پھر ابّی کے یہ الفاظ: کیا گھر میں اکیلے تھے؟ یہ سنتے ہی میرا ذہن

فوراً دادا جان کی طرف چلا گیا جو "ندوی منزل" میں میرے بھائیوں کے ساتھ تنہا سوتے تھے اور باقی لوگ ندوہ والے گھر میں سوتے تھے۔

اور پھر ابّی کے یہ الفاظ: کیا اسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی؟

یہ سب سن کر میری گھبراہٹ بڑھتی ہی چلی گئی، دل جیسے کانوں میں دھڑک رہا تھا لیکن کچھ یہ اطمینان بھی تھا کہ شائد کسی اور کے بارے میں یہ گفتگو ہو رہی ہو لیکن جب ابی نے عرفی، عبید، وہاب چچا کے نام تواتر سے لینا شروع کئے تو میری حالت اور غیر ہوگئی، جان جیسے پیروں سے کھنچ کر سینے تک آگئی اور مجھے دادا جان کے خیال نے تڑپادیا کہ یہ ساری گفتگو کہیں دادا جان ہی کے متعلق تو نہیں تھی؟

یہ سوچ کر دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا، ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے، پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں، اور میں چند سکنڈ اپنا دل تھامے بے جان سی پڑی رہی، ابّی نے فون پر کب گفتگو ختم کی اس کا مجھے کوئی ہوش نہیں۔

پھر میں کب اپنے بستر سے اٹھی؟ اور کیسے دوسرے کمرے تک پہنچی اس کا بھی مجھے کچھ پتہ نہیں! زہراء بھی میرے ساتھ ہی اٹھی، میں ابّی کے کمرے میں پہنچی تو دیکھا ابّی اپنے بستر پہ پڑے ہلکی آواز میں گریہ کناں ہیں، میرا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا، زہراء تو گھبرا کر ابّی ابّی کہتے ہوئے ابّی سے لپٹ کر رونے لگی، وہ شاید یہ سمجھی کہ ابّی کو کچھ ہوگیا ہے اس لئے رو رہے ہیں، اور امّی بستر پہ بیٹھی گھبراہٹ اور آنسوؤں کے درمیان بس یہی الفاظ دہرائے جارہی تھیں: کون چلا گیا؟ کیا ہوگیا؟

میں دھڑکتے دل، تھرتھراتے جسم، منتشر دماغ، بے جان سے پاؤں لئے، دل ہی دل میں دادا کی سلامتی کی دعاء مانگتی، کبھی امّی کو دیکھتی، کبھی ابّی

کو، اور کبھی خلاؤں میں گھورنے لگتی، پھر اچانک ابّی اٹھے اور کچھ بولے بغیر چپ چاپ برآمدے میں فون کی طرف بڑھے، امّی بھی اٹھ کر ان کے پیچھے ہولیں اور میں سکتہ کے عالم میں وہیں دل تھامے کھڑی رہی، ابّی سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اور پھر دل کو ایک آس بھی تھی کہ شائد یہ سب کچھ غلط ہو، کیونکہ ابھی اپنے کانوں سے میں نے "انتقال" کا لفظ نہیں سنا تھا، کائنات گویا تھم سی گئی تھی، ابّی عبدالجلیل چچا کو دبئی فون کر رہے تھے، ذرا دیر خاموشی کے بعد اچانک ابّی کی گلوگیر آواز سنائی دی "ابا کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا" اور میری زبان پر بے ساختہ "انا للہ وانا الیہ راجعون" جاری ہوگیا۔

ہائے اللہ میرے کانوں نے یہ کیا سن لیا؟ نہیں! نہیں! یہ جھوٹ ہے، شاید ایک خواب ہے، لیکن نہیں یہ جھوٹ نہیں حقیقت تھی، ہائے میرے دادا جان چلے گئے اور میں ان کے پاس جانے کے لئے دن ہی گنتی رہی، ان کے پاس جانے کا انتظار ہی کرتی رہی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میں تو ان کی کوئی خدمت بھی نہ کر سکی! اب میں وہاں کس دل سے جاؤں گی؟ اور جاؤں گی تو کس کے کھانے کا اہتمام کروں گی؟ کس کو پھلکے پکا کر کھلاؤں گی؟ کس کو عصر کی نماز کے لئے اکثر اٹھاؤں گی؟ اب کون مجھے بلا کر پوچھے گا کہ بٹیا کھانا کھلاؤ گی؟ بٹیا کیا پکایا ہے؟ اب کان ان کی آواز کو ترسیں گے، ہائے اللہ میں تو ڈھائی سال سے ان سے مل بھی نہ سکی تھی، کب سے انتظار کر رہی تھی کہ اس سال کب میرے سالانہ ایگزام ختم ہوں اور میں لکھنؤ دادا کے پاس جاؤں، ان کی خدمت کروں، ان سے کچھ قیمتی باتیں سیکھوں، ہائے دادا کیسے چلے گئے آپ؟ میں تو آپ سے پھر مل بھی نہ سکی، کاش میرا انتظار کر لیتے آپ!

آپ کے پاس جانے کی، آپ سے دوبارہ ملنے کی حسرت دل ہی میں رہ

گئی، اب جیتے جی میں کبھی آپ سے نہ مل پاؤں گی، آپ کی آواز نہ سن سکوں گی، ہائے یہ زندگی بھر کی کیسی حسرت، کیسی بیقراری مل گئی مجھے، ہائے آپ سے نہ مل پانے کا مداوا اب کیونکر ہوگا؟ کیا میں یوں ہی تڑپتی رہوں گی؟

دادا جان کی ایک ایک بات رہ رہ کے یاد آرہی تھی اور ہر ہر بات دل کو تڑپا رہی تھی، روح کو سسکا رہی تھی اور اشکوں کی طغیانی کو بڑھا رہی تھی۔

ہائے دے کر اچانک غم چل دیئے
چھوڑ کر دادا ہمیں سوئے ارم چل دیئے
کتنے جلتے ہیں آنکھوں میں اشکوں کے چراغ
دے کر اپنی یاد ہائے لطف وکرم چل دیئے

یہ رات شائد میں زندگی بھر نہ بھلا پاؤں گی، اور پھر بہت دیر بعد آنسوؤں کو بمشکل ضبط کرتی امّی ابّی کے سمجھانے پر قرآن پڑھنے بیٹھ گئی، لیکن ہائے رے بیقراری! قرآن ہاتھ میں لیتے ہی اور دادا کا تصور آتے ہی باوجود ضبط کے اشکوں کی روانی مزید بڑھ گئی، جتنی دیر قرآن پڑھتی رہی اشک بہتے رہے، گھنٹے گزرتے رہے، اور ابّی وقفہ وقفہ سے لکھنؤ فون کرتے رہے، اور جب دادا کی تکفین وتدفین کے بارے میں گفتگو ہوئی کہ " فلاں جگہ دفن ہونا ان کی خواہش تھی" تم لوگ خود نہلانا اور کفنانا، تدفین کب ہوگی؟ عبدالجلیل (چچا) کا انتظار کرلینا وہ دبئی سے رات ہی میں روانہ ہوچکے ہیں" تو یہ سب سن سن کر میرا دل جیسے بیٹھنے لگتا، اور جب یہ اطلاع ملی کے تدفین ہوگئی تو میرا دل جیسے کسی نے شکنجے میں کس دیا، دل کا حال بگڑنے لگا اور میں دل تھام کے بیٹھ گئی، اور میری آنکھیں عالمِ تصور میں ان کی تدفین کا منظر دیکھنے لگیں:

" اب لوگ انھیں قبر میں اتار رہے ہیں، اب قبلہ رخ لٹا رہے ہیں، اب قبر میں پٹرے رکھ رہے ہیں، اب قبر پر مٹی ڈال رہے ہیں، اور اب

سب لوگ دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے کھڑے ہیں، اور ..... اور اب سب انھیں شہرِ خموشاں میں تنہا چھوڑ کر واپس جارہے ہیں، اب وہاں کسی ذی روح کا نام ونشان نہیں، صرف رات ہے اور رات کا سناٹا ہے"

مگر ..... مگر ہاں! میں ان کے دن ورات کے بعض ساتھیوں کو ان کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہوں جو تیزی سے دادا کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان سے مصافحہ کررہے ہیں، ان سے معانقہ کررہے ہیں، اور اب ان کو مبارک باد دے رہے ہیں، اور ان کو دلاسہ وتسلی دے رہے ہیں، لیجئے آپ بھی ان کے زندگی بھر کے ساتھیوں کو پہچان لیجئے، یہ کون نادیدہ ساتھی ہیں؟ یہ ان کی نمازیں ہیں، یہ ان کی جماعت کی پابندی اور صف اول کی تکبیر تحریمہ ہے، یہ ان کی تہجد کی نمازیں ہیں، یہ ان کا ذکر الٰہی ہے، یہ ان کی مناجات ہے، یہ ان کی آہِ سحرگاہی ہے، یہ ان کی دعاءِ نیم شبی ہے، یہ ان کی مسلموں اور غیر مسلموں میں تبلیغ ودعوت ہے، یہ ان کی نرم نگاہی اور غضِ بصر ہے، یہ ان کی مروت وہمدردی ہے، یہ ان کے اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ ہیں۔

میں یہ سطور لکھ رہی ہوں اور میرے کانوں میں ان کی فون پر پہلی اور آخری آواز گونج رہی ہے، ارے بولتی کیوں نہیں؟ تیری تو آواز ہی نہیں نکلتی؟

ایک بار خلاف معمول دوپہر میں ان کا کسی ضرورت سے فون آیا اتفاق سے وہ فون میں نے اٹینڈ کیا، میں ان کی آواز فوراً پہچان گئی لیکن گھبراہٹ اور جلدی میں کچھ بول نہ سکی تو انھوں نے مجھے ڈانٹ کر کہا "ارے بولتی کیوں نہیں؟ تیری تو آواز ہی نہیں نکلتی" ان کی ڈانٹ کھا کر ایکدم سے میرا دماغ ٹھکانے آگیا۔ میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے "فلاں صاحب خط اور کتابیں لے کر ریاض آرہے ہیں" انھوں نے صرف اتنی بات کہنے کے لئے فون کیا تھا اور پھر لائن کٹ گئی۔

دادا کا انتقال بدھ کے روز رات میں ہوا تھا، جمعرات جمعہ سعودی عرب کے حکومتی آفسوں میں چھٹی رہتی ہے، سنیچر کے روز ابّی چھٹی لینے اور رزرویشن وغیرہ کرانے کے انتظام میں لگ گئے، میرے تصور میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ابّی اپنے ساتھ مجھے بھی لکھنؤ لے جائیں گے، کیونکہ میرے ششماہی امتحان ہونے والے تھے، لیکن انھیں جیسے میرے دل کی بے قراری کا حال معلوم تھا، دو تین روز کے بعد ابّی نے عبداللہ کو بھیج کر مجھ سے معلوم کرایا کہ تمہارے امتحان کب شروع ہو رہے ہیں اور کب ختم ہوں گے؟ میں سمجھ گئی کہ ابّی مجھے لکھنؤ لے جانا چاہتے ہیں، مگر میں کیسے جاسکوں گی؟ میرے امتحان تو دس روز بعد شروع ہوں گے، یہی بات میں نے عبداللہ سے کہلا دی۔

عبداللہ کے جاتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ پرنسپل کو بعد میں امتحان لینے کی درخواست دے کر میں جا تو سکتی ہوں، کیوں نہ چلی جاؤں، لیکن میں بہت دیر تک سوچتی رہی، جاؤں یا نہ جاؤں؟ کبھی جانے کا دل چاہتا، اور کبھی دل کی حسرت جانے سے روکتی کہ اب وہاں کیا رکھا ہے؟ وہاں جاکر اب کیا کروگی؟ جن کے لئے جانا چاہتی تھی وہی نہ رہے تو کس کے لئے جاؤں؟ مگر آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ میں چلی ہی جاؤں تو اچھا ہے، اب یہاں دل بھی نہیں لگ رہا ہے، دادا کی زندگی میں نہ سہی ان کے فوراً بعد ہی سہی، ابھی فضاؤں میں ان کی مہک ہوگی، ہواؤں میں ان کی آواز ہوگی، ماحول میں ان کی نورانیت ہوگی، ابھی ان کے استعمال کی ہوئی ساری چیزیں ویسے ہی رکھی ہونگی، میں ابھی جاکر ان کے نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں محسوس کرسکتی ہوں، انھیں شعور کی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہوں، نہ گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاؤں۔

اور ایسا ہی ہوا ابّی نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر دوسرے روز پرنسپل کے نام چھٹی کی اور بعد میں امتحان لئے جانے کی درخواست لکھ کر میرے ہاتھ

میں تھمادی، میں درخواست لے کر اسکول گئی اور اپنی سعودی پرنسپل کو دیدی، وہ پہلی سطر پڑھتے ہی "ہیں" کر کے چونک گئیں اور ان کے ساتھ باقی ٹیچریں بھی، میرے اشکوں کا بندھ ٹوٹنے لگا تو انھیں چھپانے کے لئے میں نے سر جھکا لیا، اچانک ہی میری کلاس ٹیچر نے مجھ سے پوچھا "تمہاری طبعیت خراب ہے کیا" ان کے اتنا کہتے ہی میں چہرے پہ ہاتھ رکھ کر سسک پڑی، دوسری ٹیچر نے آگے بڑھ کر برائے تسلی میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا اور پھر جو مجھے سہارا میسر آیا تو میں بے اختیار ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر سسکیوں سے رودی، وہ مجھے تھپکتی رہیں اور تسلی دلاسہ دیتی رہیں، مجھے آج بھی اپنے اوپر حیرت ہوتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے کے مجھ سے یہ کیسا بے صبرا پن سرزد ہوا؟ میں اتنی بے اختیار کیوں کر ہوگئی؟ میں جو کسی عورت سے بھی بات کرنے میں شرماتی ہوں ایک سعودی ٹیچر کے گلے لگ کر کیوں کر اتنی بے صبری سے رودی؟

میں پرنسپل کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ غریب الوطن کی درخواست ایگزام کے زمانے میں منظور کرلی۔ لیکن میری کلاس ٹیچر اور میری سہیلیاں مجھ سے یہی کہتی رہیں کہ اب کیوں جارہی ہو؟ اب وہاں جاکر کیا کروگی؟ امتحان شروع ہونے والے ہیں مت جاؤ! میں ان سے کیا بتاتی کہ میں کیوں جارہی ہوں؟ بس ان کی باتیں سن سن کر بکھرتی رہی، کبھی زخمی دل سے مسکرا دیتی اور کبھی سوال کرنے والی سے نظریں چرالیتی۔

ریاض سے دہلی، دہلی سے لکھنو روانگی ہوئی تو جیسے جیسے مسافت کم ہوتی گئی دل کی بیچینی بھی بڑھتی گئی، جیسے جیسے گھر قریب آتا گیا صبر کا دامن ہاتھوں سے چھوٹتا گیا، دل میں یہی حسرت انگڑائی لیتی رہے کہ کاش دادا کو ایک بار اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لیتی! لیکن قضا وقدر میں کس کو دخل ہے، موت برحق ہے یہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے، یہاں جو آیا ہے اس کو ایک

نہ ایک دن جانا ہے " کلّ نفس ذائقۃ الموت "

ایک عجیب بات یہ ہے کہ میں نے دادا کی زندگی میں - جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے - کبھی ان کو خواب میں نہیں دیکھا، البتہ ان کی وفات سے چند ماہ پہلے ان کی موت اور زندگی کے بارے میں ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان کی رحلت کی طرف اشارہ تھا لیکن میں اسے سمجھ نہ سکی اور مطمئن رہی، کاش مجھے ایک بار بھی یہ خیال آجاتا کہ اس خواب میں ان کی وفات کی طرف اشارہ ہے تو میں ان سے ملنے کی کوشش کرتی، ان سے نہ مل پانے کا غم مجھے مزید بیقرار نہ کرتا، اور اب جب کہ وہ حیات نہیں ہیں بہت بار انھیں خواب میں دیکھ چکی ہوں، گھر کے اکثر افراد نے بھی انہیں کئی بار خواب میں بڑا خوش وخرم دیکھا ہے، ابّی تو ایک بار ان کو سفید براّق کپڑے پہنے مسجد نبویؐ میں آتے ہوئے بھی (خواب میں) دیکھ چکے ہیں۔

میرے دادا جان تو ایسے اچانک گئے کہ اب بھی دل کو یقین نہیں آتا کہ اب میرے عابد وزاہد پرُشفقت دادا جان ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن دل کو یقین دلانا پڑتا ہے اور یقین سے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے، ان کو مرحوم کہتے، سنتے، اور پڑھتے ہوئے دل کی عجیب کیفیت ہوجاتی ہے لیکن کیا کیا جائے یہ دستورِ دنیا ہے کہ جو بھی یہاں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اوران کے نقش قدم پہ چلنے کی توفیق دے، اور دادا جان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور ان کی لحد کو نور سے بھر دے، آمین ثم آمین۔

پھوپھا! ایک سایہ دار درخت

خط صفیہ خاتون (ریاض) بنام اہلیہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی ؒ

ریاض، ۱۵، فروری ۱۹۹۶ء

محترمہ پھوپھی صاحبہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد اللہ بفضل تعالیٰ اور آپ تمام بزرگوں کی دعاؤں سے خیریت سے ہوں، امید ہے کہ آپ لوگ بھی خیریت سے ہوں گی کافی دنوں سے خط لکھنے کی کوشش کررہی ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آخر کیا لکھوں؟ آپ سے تعزیت کروں یا اپنے آپ سے، پھوپھا کو مرحوم لکھنے کے لئے نہ دل تیار، نہ قلم تیار ہوتا ہے، آخر ہم سب کا رنج والم تو ایک ہی ہے، اور آپکا غم ہم سب سے سوا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ہمارے سارے بھائیوں، بہنوں کو بھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون، بیشک ہم سب بھی اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ پھوپھا کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے ساتھ خاص الخاص معاملہ فرمائے اور علیّین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں سے وعدہ فرمایا ہے، پھوپھا تو ہمیشہ اللہ کی رضا کے لئے "التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآ مرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشّر المومنین" (سورہ توبہ ۱۱۲) کا مصداق بنے رہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک وصالح بندوں کو دنیا میں خوشخبری دی ہے، قرآن میں اللہ تعالی فرماتے ہیں "جزاء ھم عند ربھم جنات عدنٍ تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابداً رضی اللہ

عنھم ورضوا عنہ ذلک لمن خشی ربہ" انشاء اللہ انکا اجر غیر ممنون ہی ہوگا" فلھم اجر غیر ممنون"

۲۸ دسمبر کی شب شائد کبھی بھلائی نہ جاسکے گی اور شب وروز کی کیفیت بتائی نہ جاسکے گی فون سے جو خبر ملی اس پر سماعت کو یقین کرنا مشکل تھا، ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ تھی اور پسینے چھوٹ رہے تھے، یہ کیا ہوگیا؟ لیکن قضا وقدر میں کس کو دخل ہے، پھوپھا کا وجود ایک ایسا سایہ دار درخت تھا جو اپنوں ہی پر نہیں غیروں پر بھی سایہ کئے ہوئے تھا، انکے سایہ عاطفت سے اور اللہ کی بہت بڑی رحمت سے ہم سب محروم ہوگئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ وہ ہمارے ابو کے قائم مقام تھے اور ہم کو اپنے ابو ہی کی طرح عزیز تھے ابو ہی کی طرح خیال رکھنے والے تھے" اللھم اغفرلہ وارحمہ"

اس حادثہ کا غم تو سارے ہی خاندان والوں کو ہے، ہمارے والدین پر کیا گزری ہوگی دو داماد قضا وقدر سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو چکے، دو بیٹیوں کے دکھوں کے غم کیا کم تھے کہ بہن کا رنج الم اب مزید ہے، اب بہنوئی نے بھی دنیائے فانی کو الوداع کہا اور اللہ کے حضور حاضر ہوگئے، اللہ ان پر اپنی رحمت کا سایہ کرے، اماں کے لئے تو آپ اپنی بہنوں سے زیادہ عزیز رہیں کیونکہ آپ دونوں کا بہت ساتھ رہا اور ہم سب بہنوں بھائیوں کو بھی آپ سے بے حد انس رہا ہے کیونکہ آپ ایک اکیلی ہی پھوپھی تھیں۔

پھوپھو اس غم کا مداوا کیسے ہوگا پھوپھا تو سارے خاندان کے لئے روشن چراغ تھے جسکی روشنی سے اپنے کیا غیر بھی فیض حاصل کرتے تھے جسنے بھی سنا ہوگا، اشکبار آنکھوں سے اللہ تعالیٰ سے "اللھم اغفرلہ وارحمہ" کی دعاء کی ہوگی یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پورا نہ ہوسکے گا، خبر سننے کے بعد

سعید بستوی کا فون آیا ان کو بھی اطلاع شاہد صاحب نے کردی تھی انھوں نے ندوی بھائیوں کو فون سے اطلاع کردی کچھ لوگوں نے رات ہی میں تعزیت کے لئے آنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر ان لوگوں سے معذرت کرلی گئی اور دن میں آنے کو کہا گیا، جب دل کو قرار آیا اور "کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون" (سورہ العنکبوت آیت ۵۷) کا خیال آیا تو بچوں کو صبر کی تلقین کی اور کہا کہ دادا سے محبت ہے تو اٹھو اور قرآن پڑھو اور دادا کی مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو، بچوں نے حکم کی تعمیل کی، میں اٹھی وضو کیا دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کی اے اللہ اس نیک بندے نے آپ کی اس آیت کی تعمیل کی "الصٰبرین والصٰدقین والقٰنتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار شھداللہ انہ لاالہ الا ھو والملائکۃ واولوا العلم قائما بالقسط لاالٰہ الا ھو العزیز الحکیم" (آل عمران ۱۸) وہ راتوں میں آپ سے رشتہ جوڑا کرتے تھے اور عبدیت کا حق ادا کرتے تھے آپنے انکو اپنے پاس بلا لیا، اب وہ آپ کے حضور حاضر ہیں، وہ اب آپ کے مہمان ہیں، آپ ان کی مہمانی قبول فرمائیں اور اپنی شایان شان ان کے ساتھ معاملہ فرمائیں، انکی لغزشوں سے درگزر فرمائیں ان کی نیکیوں کو قبول فرمائیں، تو تو رحیم، کریم، عفو اور غفور ہے۔

دعاء سے فارغ ہوئی تو بچے قرآن حکیم کی تلاوت شروع کرچکے تھے میں بھی تلاوت میں شریک ہوگئی عذراء کے ابّی قرآن پڑھتے پھر فون پر بھائیوں سے رابطہ کرتے اور ہدایتیں دیتے پھر تلاوت میں مشغول ہوجاتے اپنوں سے دوری کا احساس ہم لوگوں کے رنج وغم کو مزید ہوا دے رہا تھا، قرآن کی تلاوت ہوتی رہی آٹھ نو بجے صبح تک پورا قرآن ختم ہوگیا، تعزیت کے لئے مخلصین کی آمد ورفت شروع ہوگئی، ہم ان سب بہنوں اور بھائیوں کے تہِ دل سے شکرگذار ہیں جنھوں نے ہم غریب الدیار کی پردیس میں غمخواری کی،

ہمت اور حوصلہ دیا، صبر ورضا کی تلقین کی اور پھوپھا مرحوم کے لئے دعاء مغفرت کی، اللہ ان سب کو جزاء خیر سے نوازے۔ (آمین)

اللہ رحمان ورحیم آپ کے مرقد کو نورانی کرے
احکم الحاکمین آپ کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
۲۸ دسمبر ٹھیری آپ کی تاریخ وفات
السلام، اے روح عبدالسمیع السلام

والسلام علیکم
آپ کی بھتیجی
صفیہ خاتون

ایک حادثہ جانکاہ

حافظ عبدالجلیل الحسینی الندوی

یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة . فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (سورہ الفجر آیت ۲۸) یعنی اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف ہنسی خوشی لوٹ جا، اور میرے (نیک) بندوں میں داخل ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

قارئین محکمات کے لئے یہ ایک جگر پاش اطلاع ہوگی کہ مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی اڈیٹر محکمات و معتمد عمومی جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء بروز جمعرات مطابق ۵ شعبان ۱۴۱۶ھ رات ساڑھے بارہ بجے اچانک اس دار فانی سے رحلت فرماگئے "اناللہ وانا الیہ راجعون"

ہمارے اور آپ کے لئے تو یقیناً یہ حادثہ اچانک اور غیر متوقع ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا" (آل عمران آیت ۱۴۵) یعنی کسی نفس کے لئے موت نہیں ہے مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ وقت پر۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہر چیز کا وقت دن اور تاریخ مقرر ہے، اس سے ایک لمحہ آگے یا پیچھے ہونے کی گنجائش نہیں، اس کے علم میں ہر ہر چیز اور اس کی ایک ایک جزئیات و تفصیلات ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وعنده مفاتیح الغیب لا یعلمها الا هو ویعلم مافی البر والبحر وما تسقط من ورقة الایعلمها ولا حبة فی ظلمٰت الارض ولا رطب ولایابس الا فی کتاب مبین (الانعام آیت ۵۹) یعنی اسی (اللہ) کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، اس کے علاوہ ان کو کوئی نہیں جانتا،

اور جو کچھ خشکی میں ہے اور جو کچھ سمندر میں ہے سب جانتا ہے، اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے، اور نہ کوئی دانہ زمینوں کی تاریکیوں میں اور نہ کوئی تر چیز یا خشک چیز ہے مگر وہ کتاب مبین (قرآن کریم) میں ہے۔

کسی چیز یا واقعہ یا حادثہ کا اچانک رونما ہونا یہ صرف ہمارے اور آپ کے حساب سے ہے اللہ تعالیٰ کے حساب سے نہیں، پھر خاص طور پر زندگی اور موت کا معاملہ تو ان پانچ امور غیب میں سے ہے جن کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ " خمس لا یعلمھن الا اللہ " اور قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے "ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر " (سورہ لقمان آیت ۳۴) یعنی بیشک اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے، وہی جو کچھ رحم (مادر) میں ہے اسے جانتا ہے، کسی جان کو یہ نہیں پتہ کہ وہ کل کیا کمائے گی، اور نہ کوئی جان جانتی ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گی۔

والد صاحب کے انتقال پر آیت باری "وما تدری نفس بارض تموت " کا ایسا مشاہدہ ہوا کہ بیساختہ زبان سے نکلتا ہے " قولہ الحق ولہ الملک " والد صاحب کو اب مرحوم کہتے اور لکھتے ہی آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں، آواز گلوگیر ہوجاتی ہے، دل گریہ کناں ہوجاتا ہے اور " وانا علی فراقک لمحزونون " کی صدا دل سے اٹھنے لگتی ہے۔

والد صاحب آخری وقت تک بقائمی ہوش وحواس اپنے تمام معمولات انجام دیتے رہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فارغ ہونے والے طلباء کے الوداعیہ جلسہ میں شریک ہوئے، حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ سے ان کے سفر ارض مقدس پر رخصتی سلام ومصافحہ کیا، اور اپنی حیات مستعار کی آخری نماز عشاء بھی مسجد میں باجماعت ادا کی، استراحت کے لئے بھائی

عبدالرشید کے مکان --- جو دارالعلوم سے متصل ہی ہے --- چلے گئے، رات بارہ بجے کے لگ بھگ فرشتہ اجل نے دروازہ کھٹکھٹایا، طبیعت میں بے آرامی محسوس کی تو اٹھے، گرم کپڑے پہنے، مکان کو تالہ لگایا اور اپنے مکان واقع احاطہ دارالعلوم کا قصد کیا، لیکن وقت موعود آپہنچا تھا، مہلت کی گھڑیاں قریب الختم تھیں، ایک مکان چھوڑ کر پاریکھ آفسٹ پریس کے دروازے پر دستک دی، لوگوں نے کرسی پیش کی، فرمایا میری سانس اکھڑ رہی ہے، ڈاکٹر کو بلاؤ، پھر خود ہی گھڑی دیکھ کر فرمایا! اب اس وقت کون ڈاکٹر ملے گا، لوگوں نے ایک میز کی طرف اشارہ کرکے آرام سے لیٹ جانے کی درخواست کی۔ فرمایا " یہ تو اونچی ہے میں کیسے چڑھوں گا" لوگوں نے سہارا دے کر اوپر لٹادیا، متعلقین اور احباب کو اطلاع کی گئی، لیکن مہلت ختم ہوچکی تھی اس لئے کسی سے ملے یا کسی کو دیکھے بغیر ہی بعجلت تمام بیس منٹ کے اندر ہی علائق دنیوی سے منہ موڑ کر داعی اجل کو لبیک کہا، ایک دور ختم ہوگیا، تاریخ کا ایک باب بند ہوگیا، اخلاق وحسن معاشرت کا ایک نمونہ نظروں سے اوجھل ہوگیا، شفقتوں کی ردا تارتار ہوگئی، ہمدردی وغمگساری، الطاف وعنایات کا ایک سائبان زمین بوس ہوگیا، عظمتوں کا ایک اور آسمان، زمین کھاگئی جو ہر وقت صدائے " ھل من مزید" بلند کرتی رہتی ہے۔

وما کان قیس هلکه واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

اللہ تعالی والد صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے۔اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور " مع الذین انعم اللہ علیهم" میں شامل فرمائے۔

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مطبوعہ ماہنامہ " محکمات " لکھنو، شمارہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء

آہ! والد گرامی

سید محمد عبد الحی ثانی

والد گرامی مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب کے بارے میں کئی روز سے سوچ رہا ہوں کہ کچھ لکھوں، لیکن جیسے ہی والد صاحب کی یاد آتی ہے میں تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں۔ جب بھی میں رات گئے باہر سے گھر آتا، باہری کمرہ میں - جو والد صاحب کی آرام گاہ تھا - جیسے ہی قدم رکھتا میرے پیروں کی چاپ ختم ہو جاتی، اور میں بہت آہستہ سے دروازہ کھولتا وہ اسلئے کہ شاید والد گرامی سو نہ رہے ہوں، اور میری آمد سے انکی نیند میں خلل نہ پڑجائے، لیکن ایک مانوس سی آواز کانوں سے ٹکراتی، کون ہے؟ میں جواب دیتا " عرفی " پھر آواز آتی، کہاں تھے؟ میں جواب دیتا فلاں ضرورت سے باہر گیا تھا۔ لیکن وہ مانوس آواز اب کبھی سننے کو نہ ملے گی کیونکہ والد گرامی اچانک ہی اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں " انا للہ وانا الیہ راجعون" وہ ایسے اچانک گئے کہ ہم لوگوں کو سوچنے کا موقع بھی نہ ملا، نہ ہی ان کی کوئی خدمت کرسکے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں میرا تقرر ۱۹۹۴ء میں ہوا تھا، سوچا تھا اب والد صاحب کا ہاتھ بٹاؤں گا، میری عمر کے ۲۸ سال تعلیم میں اور پھر ادھر ادھر کسب معاش کے لئے ہاتھ پیر مارنے میں گزر چکے تھے جس کا مجھے بہت زیادہ احساس تھا۔ ادھر تین سال سے (۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۳ء) میں گھریلو مسائل کی وجہ سے کانپور ہی میں مقیم تھا۔ کانپور میں بابری مسجد منہدم ہونے سے جو واقعات رونما ہوئے تھے اسنے میرے دل کو ہلادیا تھا اور سوچا کہ اب والد صاحب ہی

کے پاس چل کر رہا جائے۔ دسمبر ۱۹۹۳ء کے اواخر میں میں لکھنؤ آگیا، میں نے والد گرامی سے کہا کہ اب گھوم پھر کر تھک گیا ہوں لہذا اب ندوہ ہی میں کوئی جگہ تلاش کریں! والد مرحوم نے فرمایا یہاں کہاں لگو گے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور ندوہ کے کچھ ذمہ دار حضرات سے تذکرہ کیا، حسن اتفاق سے ایک جگہ خالی تھی، میں نے فوراً ایک درخواست مولانا رابع صاحب حسنی مدظلہ العالی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) کی خدمت میں پیش کی، مولانا مدظلہ العالی نے والد صاحب اور شاہد حسین صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء سے مشورہ کے بعد میری ملازمت کی منظوری دیدی، یہ خوشخبری مجھے شاہد حسین صاحب کے ذریعہ مل گئی۔

دوپہر میں جب والد صاحب دفتر سے گھر آئے تو بتایا کہ مولانا مدظلہ العالی نے تمہارا تقرر ہمارے ہی دفتر نظامت میں بحیثیت سپروائزر اوقاف کیا ہے۔ کل صبح سے پابندی سے ڈیوٹی پر جایا کرنا۔ میں عموماً والد صاحب سے پہلے ہی دفتر پہنچ جاتا، دفتر کے کاموں میں والد صاحب مجھے اکثر مشورہ دیتے اور ندوہ کے بہت سے کام جو مجھ سے متعلق نہ تھے مجھے پکڑا دیتے، وقف بورڈ سے متعلق ایک کام کے سلسلہ میں میں نے ان سے مشورہ چاہا تو انھوں نے فرمایا کہ میں ایک پرچہ لکھ رہا ہوں وقف بورڈ جانا تو فلاں صاحب کو دے دینا، میں نے ایسا ہی کیا، میں نے وقف بورڈ کے متعلقہ صاحب کو جب وہ پرچہ دیا تو انھوں نے پرچہ پڑھا اس میں تحریر تھا:

"یہ میرے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں کسی کام کے متعلق آپ سے کچھ معلومات کرنا چاہتے ہیں، اور اب یہ ندوۃ العلماء کی طرف سے آپ سے برابر ملاقات کرتے رہیں گے، آپ کی توجہ چاہوں گا"

والسلام
محمد عبدالسمیع

ملازمت کرتے ہوئے ابھی ایک سال پانچ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد صاحب کو میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی، اور مہینہ بھر کے اندر یعنی ۹ جولائی ۱۹۹۵ء کو میری شادی فتحپور ہسوہ کے سادات خاندان میں جناب انیس الرحمٰن صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوگئی، میری شادی کا ہونا میرے لئے ایک خوشگوار حادثہ تھا، اس حادثہ سے ابھی میں سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ میری اہلیہ کے ماموں جناب شمیم احمد ندوی کے صاجزادے کی شادی ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ہونا طے پاگئی، شادی کا دعوت نامہ والد صاحب کو ملا اور انھوں میری اہلیہ کے دوسرے ماموں جناب نجم الدین صاحب کو بذریعہ خط اطلاع کردی کہ میں ان شاء اللہ شادی میں شرکت کروں گا، لیکن ۲۶ دسمبر کو جب والد گرامی معمول کے مطابق دفتر سے گھر واپس آئے تو دوپہر کے کھانے کے بعد مجھ سے فرمایا تمہاری اہلیہ کہاں ہیں بلاؤ! میں ان کو بلا لایا، والد صاحب نے ان سے کہا شادی میں تم فتحپور جارہی ہو، اہلیہ خاموش رہیں، پھر مجھ سے کہا تم فتحپور شادی میں جارہے ہو؟ میں نے کہا مجھے چھٹی نہیں ملے گی آپ ہی چلے جائیں، والد صاحب یہ سن کر خاموش ہوگئے۔

پھر ۲۷ دسمبر کا سورج طلوع ہوا ہم دونوں دفتر پہونچے، والد صاحب سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی، وہ کرسی پر بیٹھے اور دفتر کی بر آورد چک کرنے میں مصروف ہوگئے، اس درمیان میں کسی کام سے پھری چلاگیا، میں جب دوپہر میں تین بجے گھر پہونچا تو والد گرامی آرام کررہے تھے یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا، کچھ پتا نہ تھا کہ رات میں کچھ ہونے والا ہے، کچھ علم بھی نہ تھا کہ ہم کیا کھونے والے ہیں؟ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا، گھڑی پر نظر پڑی تو پونے چار ہورہے تھے، والد صاحب نے مجھے آواز دی. جسے میں سن نہ سکا، میری اہلیہ نے کہا کہ ابا بلا رہے ہیں! میں ان کے پاس پہنچا تو والد صاحب اٹھ چکے تھے اور وضو بھی کر چکے

تھے، میں نے کہا کیا آپ نے مجھے آواز دی ہے؟ کہنے لگے ہاں! میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ ان سے میری آخری گفتگو ہوگی۔

فرمایا تم اہلیہ کو لے کر فتحپور چلے جاؤ، میں نے کہا میں کیسے جاؤں؟ میری چھٹیاں بھی نہیں ہیں؟ فرمایا میں مولانا طاہر صاحب (دفتر نظامت کے انچارج) سے کہہ دونگا، رشتہ داری تم کو قائم رکھنا ہے اس لئے تمہارا جانا ہی بہتر ہوگا۔ میں عجیب تذبذب میں پڑگیا، آخر کچھ سوچ کر اہلیہ سے کہا کہ میں عصر کی نماز پڑھنے جارہا ہوں تم تیار ہوجاؤ۔ اہلیہ نے کہا ہم نہیں جائیں گے، میں نے کہا ابا کا حکم ہے، چلو تیار ہوجاؤ۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر میں گھر آگیا، معمول کے مطابق والد صاحب چائے پینے لگے اور ہم دونوں تیاری میں مصروف ہوگئے، تیار ہو کر والد صاحب کے پاس آکر کھڑا ہوگیا تو انھوں نے فرمایا کب آؤ گے؟ میں نے کہا کل دوپہر میں ولیمہ کے بعد چلدونگا، فرمایا نہیں، کافی دنوں سے کہیں نہیں گئے ہو اسلئے دو تین روز کے بعد اطمینان سے آنا، اور ہاں میں یہاں دفتر میں بتادونگا، اور سنو وہاں جاکر شادی سے فراغت کے بعد حکیم اسرار الحق سے ملاقات کرلینا۔ ان کو میں نے ایک خط لکھا ہے وہ ہمارے لئے دوائیں دیں گے، ان کی دوا سے مجھے فائدہ ہوا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے میری اہلیہ کے ماموں نجم الدین صاحب کے نام ایک خط دیا، اور ایک لفافہ جس میں غالباً کچھ رقم تھی دے کر فرمایا کہ یہ فلاں مسماۃ کو دیدینا وہ بیوہ ہیں۔ والد صاحب سے میری یہی آخری گفتگو اور آخری ملاقات تھی۔

ہم دونوں رکشہ سے چار باغ پہونچے، سوئے اتفاق سے وہاں کوئی بس نہ تھی، ایک گھنٹہ انتظار کے بعد میری اہلیہ نے کہا میرا دل گھبرارہا ہے واپس گھر چلئے، میں نے اہلیہ کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور کہا اب گھر سے نکل آئے ہیں تو چاہے رات ہوجائے واپس نہیں جاؤں گا۔ میری اہلیہ نے دوبارہ میرے کان میں وہی سرگوشی کی۔ میں نے کہا چاہے کانپور ہوکر فتحپور جانا

پڑے لیکن اب واپس گھر نہ جاؤں گا۔ خیر اللہ اللہ کرکے سات بجے کے قریب فتحپور والی بس ملی۔ ساڑھے گیارہ بجے فتحپور پہونچے۔ شادی کی رات تھی سارا گھر جگمگا رہا تھا، ٹھیک پونے بارہ بجے کھانے پر بلایا گیا لیکن نہ جانے کیوں ایک لقمہ ہی کھایا ہوگا کہ طبعیت مالش کرنے لگی، میں نے کھانا چھوڑ دیا، بعض اعزہ واقارب نے اصرار بھی کیا لیکن طبعیت کھانے کی طرف مائل نہ ہوئی، تقریباً ۱۲ بجے، رات کے سناٹے میں میں ٹہلنے نکل گیا کہ شاید طبعیت کچھ بہل جائے۔ ساڑھے بارہ بجے ٹہل کر واپس آیا تو سونے کی غرض سے ہال میں گیا وہیں میرے خسر بھی موجود تھے انھوں نے بلایا اور اہلیہ کے ماموں جناب سمیم احمد مدنی سے میرا تعارف کرایا، اسکے بعد میں لیٹ گیا، تکان بہت تھی لیکن نیند پھر بھی کوسوں دور تھی۔ لائٹ بجھا کر سب ہی لوگ لیٹ گئے میں نے لحاف کے اندر منھ کرلیا کہ شاید نیند آجائے اسی وقت ایک جانی پہچانی آواز آئی عرفی عرفی ---- میرے خسر کی آنکھ کھل گئی، انھوں نہ کہا کہ وہ سو رہے ہیں، میں نے جیسے ہی لحاف کے اندر سے منھ نکالا دیکھا تو حامد بھائی سامنے کھڑے ہیں، انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے عرفی تمہارے ابا کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ سنتے ہی میرے حواس اڑ گئے، کیا یہ مذاق ہے؟ مگر اتنا بھیانک مذاق میرے ساتھ کون کریگا؟ میری آنکھ سے آنسو رواں ہوگئے اور میں خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر باہر کی طرف چلدیا، کئی بار گرتے گرتے بچا، اور نہ جانے کن کن ہاتھوں نے مجھے سہارا دیا۔ میں کمرے سے نکل کر سڑک پر آگیا، ادھر ادھر دیکھا کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ بس اڈہ کدھر ہے؟ میں بے خیالی میں ایک طرف چلدیا۔ مولانا مرتضیٰ صاحب مرحوم جو کہ میرے خلیہ سسر بھی ہوتے ہیں ان کے چھوٹے صاجزادے مولوی عمیر حسینی ندوی بھی اس شادی میں شریک تھے، ان کی جانی پہچانی آواز کانوں سے ٹکرائی "

عرفی صبر کرو، ان اللہ مع الصابرین۔ تم اپنے کو سنبھالو۔ پھر گھر کی طرف سے دو آوازیں آئیں معلوم ہوا کہ میری اہلیہ گر پڑیں ہیں، کیسے اکا مجھے علم نہیں! پھر میرے خسر مولانا انیس صاحب نے آکر مجھے کندھے سے لگالیا اور کہا اپنے کو سنبھالو، پھر میں نے تفصیل معلوم کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ فضیل ہاشمی کا فون آیا تھا۔ ادھر گھر میں میری اہلیہ کی طبعیت گرتی جارہی تھی، مولانا مجھے لے کر گھر آئے، میں وہاں کسی اجنبی کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا اور تمام لوگ تماشائی بنے میری جانب دیکھتے رہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا میں فوراً لکھنؤ جانا چاہتا ہوں، آپ کا کیا پروگرام ہے؟ مولانا نے فرمایا اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے ہیں کسی بس کا وقت نہیں ہے، آخری بس شام کو ساڑھے پانچ بجے جاتی ہے اسکے بعد کوئی بس نہیں جاتی، البتہ میں عمیر صاحب سے معلوم کرتا ہوں، وہ اپنی گاڑی (ٹیکسی) لے آئے ہیں اس سے تم چلے جاؤ۔ عمیر صاحب سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ اب ہم سبھی لوگ واپس چلتے ہیں، میں نے اہلیہ سے کہا کہ تمہاری طبعیت ٹھیک نہیں ہے تم یہیں رکو بعد میں آجانا لیکن وہ نہ مانی اور ساتھ ہی چلنے پر اصرار کیا۔

بعد نماز فجر ہم سبھی لوگ بذریعہ ٹیکسی لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے، راستہ میں مجھے خیال آیا کہ پتہ نہیں میری بڑی بہن جو سید اشفاق حسین کو لودی پور گاؤں میں منسوب ہے اسے خبر ہوئی یا نہیں؟ اس لئے جب گاڑی گربخش گنج چوراہے پر پہنچی تو میں نے گاڑی رکوادی (یہیں سے ایک سڑک کھیروں ہوتی ہوئی لودی پور جاتی ہے) اور ایک جیپ ڈرائیور سے کہا کہ اشفاق حسین صاحب کو جانتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! میں نے اسکو کرایہ دیا اور ایک پرچہ لکھ کردیا کہ یہ ان کو دیدینا، اور ممکن ہو تو اسی جیپ میں سب کو لے کر لکھنؤ آجانا۔ یہ کہہ کر ہم لوگ لکھنؤ کو چل دیئے۔

میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اور گھر کے بارے میں اور بھائی بہنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گھر کا چراغ بجھ گیا، اور تسبیح ٹوٹ گئی ایسا نہ ہو کہ تسبیح کے یہ دانے بکھر جائیں، جوں جوں منزل قریب آتی گئی عجب عجب خیالات آتے رہے، کچھ ہی دیر میں ہم لوگ لکھنؤ پہونچ گئے، صبح کے تقریباً پونے دس بج رہے تھے، گاڑی جیسے ہی ندوہ کے گیٹ پر آئی لڑکوں کا ایک ہجوم گھر سے آتا ہوا اور ایک ہجوم گھر کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ دل بیٹھا جارہا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے، اللہ اللہ کر کے گھر کے اندر قدم رکھا، اندر شور اٹھا، عرفی آگیا! بڑے بھائی عبدالرحمٰن وعبیدالرحمٰن اور میرے بھتیجے عبدالحمید وعبدالوحید سب ایک ایک کر کے مجھ سے لپٹ گئے، پھر والدہ آئیں اور انھوں نے اپنے کندھوں سے لگالیا، ایک ہُو کا عالم تھا، میں اب تک ضبط کئے ہوئے تھا، مگر منجھلی بہن نے جیسے ہی دیکھا کہ عرفی آگیا تو فوراً ہی رونا شروع کردیا، اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوچکا تھا، سب غمزدہ بیٹھے تھے اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے، بڑے بھائی عبدالرحمٰن نے تسلی دی کہ صبر کرو، اور دیکھو سب کو خبر کردی گئی ہے یا نہیں؟ میں نے پوچھا کہ بڑے بھائی جو ریاض میں رہتے ہیں ان کو خبر ہوئی یا نہیں؟ انھوں نے کہا ہاں، ان کو خبر ہوگئی ہے اور دوسرے بھائی جو دبئی میں ہیں ان کو ریاض سے خبر مل گئی ہے اور وہ دبئی سے روانہ بھی ہوچکے ہیں، اس کے بعد میں مولانا معین اللہ صاحب نائب ناظم ندوۃ العلماء سے ملاقات کے لئے چلا گیا، مولانا نے فرمایا کہ مٹی کب اٹھا رہے ہو؟ میں نے کہا بھائی عبدالجلیل کا انتظار ہے وہ صبح ہی دبئی سے چل چکے ہیں اس لئے ان کا انتظار ضروری ہے ورنہ جو حکم آپ کا ہو، مولانا نے فرمایا: مٹی اٹھانے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس دن سالانہ امتحان کا پہلا پرچہ تھا لیکن والد صاحب کی وفات کی خبر ملتے ہی ندوہ کے ذمہ داروں نے چھٹی کا اعلان کردیا،

بھائی عبدالجلیل کا انتظار ہم لوگوں نے عصر کی نماز تک کیا لیکن وہ نہ پہنچ سکے، بعد نماز عصر والد صاحب کی نماز جنازہ پڑھی گئی، ندوہ کے تمام حضرات نماز جنازہ میں شریک ہوئے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی جو کافی ضعیف ہوگئے ہیں اور اکثر بیمار رہتے ہیں وہ بھی جنازہ میں شریک ہوئے اور قبرستان تک تشریف لائے، والد صاحب کو ان کی آخری منزل یعنی قبر میں میں نے اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعزیز اور عبدالرحمن نے اپنے ہاتھوں سے اتارا اور قبر میں لٹایا، اس کے بعد ان کو مٹی دی اور ان کے لئے دعاء مانگی، پھر سب ہی حضرات مٹی دینے لگے۔ مٹی سے فارغ ہو کر میں نے حاضرین سے درخواست کی کہ جن حضرات کا والد صاحب پر کوئی قرض ہو وہ بتادیں ہم ادا کرنے کو تیار ہیں، واپسی میں جب گھر پہونچا اور کمرے میں داخل ہوا تو بے اختیار میرے پیروں کی چاپ دھیری ہوگئی کہ مبادا والد صاحب کی آنکھ نہ کھل جائے۔

آج بھی جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوتا ہوں تو غیر شعوری طور پر میرے قدم آہستہ ہوجاتے ہیں اور کان ایک مانوس سی آواز سننے کے منتظر ہوتے ہیں : کون ؟ اور جب کمرے میں ان کو موجود نہیں پاتا تو ایکدم خیال آتا ہے کہ شاید والد صاحب آج کانپور گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھی بھائیوں بہنوں اور خاص طور سے والدہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور والد صاحب کو جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ (آمین)

ماموں صاحب !

خط شمیم احمد فاروقی بنام عبدالجلیل حسینی ندوی (دبئی)

برادرم عبدالجلیل ! السلام علیکم

آج جبکہ گھر میں سلمیٰ کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں ..... کہ دوپہر کو ڈاکیہ نے آپکا لفافہ دیا، کھول کر پڑھتے ہی کہرام مچ گیا، خالہ صاحب ویسے ہی کافی عرصہ سے بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں، دو بڑے حادثہ خاندان پر گزر چکے ہیں، پہلے خالو صاحبکا انتقال اور پھر چھ ماہ بعد آپ کی آپا (نجمہ مرحومہ) کا صدمہ، آج آپکے خط سے دو پیاری ہستیوں کی رخصتی کا علم ہوا، علم بھی ہوا تو تقریباً تین ماہ بعد، اللہ پاک ماموںصاحب اور مجید ماموں کے صغیرہ وکبیرہ گناہ معاف فرمائے، دونوں حضرات کی مغفرت فرمائے، موت برحق ہے اور ہر ایک کو اسکا مزہ چکھنا ہے، کوئی بھی اپنے وقت مقررہ سے پہلے نہیں جاتا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لواحقین کو صبر آتے آتے آتا ہے۔ آپ لوگ باپ کی شفیق ہستی سے محروم ہوگئے۔ اللہ پاک آپ لوگ کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔

مجید ماموں سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، اکا صرف کبھی کبھار نام ہی سنا لیکن ماموں صاحب سے نہ صرف ملاقات رہی خط وکتابت کا بھی سلسلہ رہا، بلکہ ہوش سنبھالنے پر والدہ صاحبہ سے اور خاندان کے دوسرے بزرگوں سے اکا برابر تذکرہ سنتا رہا کہ وہ اتنی دور ہونے کے باوجود کبھی بھی ہملوگوں کے لئے اجنبی نہیں رہے۔ آپکی آپا مرحومہ بھی ماموںصاحب کی محبتوں اور شفقتوں کا برابر چرچا کرتی رہیں اور پھر ملاقات پر ان کو ویسا ہی پایا، آپ جانتے ہوں گے کہ نانا صاحب اور میرے خاندان کے مراسم کتنے گہرے تھے،

ماموں صاحب مرحوم بھی اس تعلق سے ہم لوگوں کے لئے عزیز ترین تھے۔ یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ آج ہم لوگوں کے درمیان سیاسی دیواریں اتنی اونچی حائل ہیں کہ انکی رخصتی پر ہم خط کے ذریعہ آپ سے ایک اجنبی کی حیثیت سے تعزیت کر رہے ہیں، اگر ہم لوگ کو وقت پر اطلاع مل بھی جاتی تو بھی ہملوگوں کی آخری رسومات میں شرکت ممکن نہ ہوتی۔ اللہ پاک کو یہی منظور تھا۔

برادرم جلیل! ہملوگوں کی نسل تو پھر کسی نہ کسی طور پر ایک دوسرے سے غائبانہ تعارف رکھتی ہے، ہماری آنے والی نسل تو اب اس سے بھی محروم ہے، یہ کیسی سیاسی تقسیم تھی کہ جس نے خون سے خون کو جدا کردیا، اگر تقسیم کے حقیقی مقاصد پورے ہوجاتے تو پھر بھی صبر آجاتا، یہاں تو ہملوگوں کے ساتھ ایسا مذاق ہوا کہ بقول شاعر۔

نہ خداہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ہم لوگ تو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا تو دور کی بات اسے محسوس کرنے سے بھی قاصر ہوتے جارہے ہیں، اگر آپ کا خط نہ ملتا تو ہملوگ اس سانحہ سے بالکل غافل رہتے، ماموں صاحب مرحوم پابندی سے خطوط تحریر کرتے تھے، کوڑہ کی تاریخ بھی ارسال کی، ہملوگوں کی طرف سے بھی تاخیر سے خط کا جواب روانہ کردیا جاتا، کبھی ملتا اور کبھی راستہ ہی میں تلف ہوجاتا اس طرح ایک سلسلہ قائم تھا۔ غالباً گذشتہ چھ ماہ سے یہ رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ہم لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ رابطہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ رہا ہے، موجودہ دنیا مواصلاتی طور پر سکڑ چکی ہے لیکن ہم لوگوں کے لئے نہیں۔ لقمان خالو کے انتقال کی خبر آدھے گھنٹے میں مل گئی لیکن افسوس ہم لوگوں کے لئے جو وہاں سے واحد رابطہ کی ہستی تھی اس کے انتقال کی خبر تین ماہ بعد ہوئی۔

وہاں سے فون کا اور خط کا رابطہ پھر بھی جلدی ہوجاتا ہے، لیکن یہاں بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ محفوظ خطوط کے لئے دوسرے ممالک میں عزیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے جب سے اطلاع ملی ہے خالہ صاحبہ، مما (حکیم احمد علی) اور میری والدہ (آپکے والد کی احمدی آپا) کا غم سے برا حال ہے۔

برادرم جلیل! آپ نے یا آپکے چھوٹے بہن بھائیوں نے ان لوگوں کو یکجا نہیں دیکھا ہوگا۔ میری یہ خوش نصیبی تھی کہ میں نے مختصر عرصہ ہی سہی ان لوگوں کو یکجا دیکھا ہے، انکی محبتوں اور قربتوں کو محسوس کیا ہے، مجھے اندازہ ہے کہ اس خبر نے بہن خالہ اور میری والدہ پر کیا اثر چھوڑا ہے اور مما ان کے ساتھی بھی تھے۔ جامع مسجد بنوری ٹاؤن کے پیش امام صاحب کو بھی اطلاع کرونگا، وہ انکے دوست ہیں اور انکے ذریعہ بھی مجھے ماموںصاحب کی خیر خبر ملتی رہتی تھی۔ ماموںصاحب سے دو بار چند ماہ ملاقات رہی، آخری ملاقات غالباً نفیس کی شادی کے موقع پر انکی آمد پر ہوئی، برادرم عبدالرشید سے بھی اسی موقع پر ملاقات ہوئی تھی پھر خط وکتابت سے رابطہ رہا، نجمہ مرحومہ کے انتقال پر انکا میرے نام حوصلہ اور صبر کا تعزیت نامہ میرے لئے باعثِ تقویت تھا۔

ہم آج ایک ایسی ہستی سے --- جو کہ جغرافیائی اور سیاسی مجبوریوں کے باعث دور ہونے کے باوجود قریب تھی --- محروم ہوگئے تو آپ لوگوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ ہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنے سے بھی قاصر ہیں، ہم ایک دوسرے کی دلی کیفیت سے بھی واقف نہیں ہیں، یہ ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

کیا ماموںصاحب کے رابطہ کو آپ قائم رکھ سکیں گے؟ مجھے امید ہے آپ اس رابطہ کو قائم رکھیں گے کیونکہ آپ ہی نے اطلاع دینے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ حفیظ ماموں ٹنڈو محمد خان (کراچی سے دور ایک قصبہ میں)

ملازمت کے سلسلہ میں رہتے ہیں، صحت انکی بھی اچھی نہیں، انھیں ابھی اطلاع نہیں ہے، انھیں بہانے سے بلایا جارہا ہے تاکہ یہاں دو بھائیوں کے انتقال کی اطلاع پاکر صدمہ کے وقت تسلی دینے والے تو ہوں وہاں تنہائی میں کون سنبھالے گا؟ اللہ انکو حوصلہ اور صبر نصیب فرمائے۔

بہن خالہ کا تو حال یہ ہے کہ رو رہی ہیں اور کہتی ہیں میرے دونوں بھائی چلے گئے۔ بھائی صاحب کی ذات سے امید تھی کہ کبھی وہاں جاسکوں گی۔ اب میرا وہاں کون بڑا ہے جس کے پاس جاؤں، جس پر مان کروں۔

ہم سب ان کے لئے، مجید ماموں کے لئے اللہ پاک سے مغفرت اور بلند درجات کی دعاء کرتے ہیں، قرآن خوانی، فاتحہ خوانی کے علاوہ ہم لوگ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ اللہ پاک ہم سب متاثرین کو صبر جمیل نصیب فرمائے، امید ہے آپ خط کے ذریعہ ممانی صاحبہ اور تمام بہن بھائیوں کی فرداً فرداً خیریت سے آگاہ فرمائیں گے اور ہم سب کے جذبات سے وہاں (بھارت میں) متاثرین کو آگاہ کریں گے، اللہ پاک آپ سب کو اس عظیم صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، برادرم رشید نے بھی سلام علیک اور صبر کی تلقین عرض کریں، مجھے امید ہے آپ ماموں صاحب مرحوم کے رابطہ کو بحال رکھیں گے، گھر میں سب لوگ سلام کہتے ہیں، جواب کا منتظر۔

شمیم احمد فاروقی

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی صاحبؒ

مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو

ندوۃ العلماء کے شعبہ تعمیر وترقی کے معاون ناظر مولانا سیّد محمد عبدالسمیع ندوی صاحب ایک باوقار وبااخلاق خادم ملّت، عالم دین اور کارپرداز شخصیت تھے جو سال رواں (۱۴۱۶ھ) ماہ شعبان کے اوائل میں ایک قلبی دورے کے نتیجہ میں اس حیات فانی سے حیات باقی کی طرف کوچ کرگئے۔

انھوں نے ۷۵ سال عمر پائی، مرنجا مرنج متحرک اور فعال طبعیت کے مالک تھے، زندگی علوم دینیہ کی خدمت، کتابوں کی اشاعت اور علوم دینیہ کے اعلی مقاصد کے اداروں کی خدمت میں صرف کی۔

انھوں نے تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند دونوں جگھوں سے حاصل کی اور دونوں جگھوں کی خصوصیات سے استفادہ کیا تعلیم سے فراغت کے بعد چند سال کانپور کی ایک معروف دعوتی وملی انجمن "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" کے کاموں سے دلچسپی لی پھر ندوۃ العلماء کے کارگزاروں میں شامل ہوئے۔ شعبہ تعمیر وترقی کے قیام کے بعد اس کے ناظر کے معاون کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی جو تاحیات قائم رہی، شعبہ تعمیر وترقی، ندوۃ العلماء کے تعمیری، اشاعتی اور ترقیاتی کاموں کے ذمہ دار، شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا، اس کے تحت مطبعہ، تجارتی مکتبہ اور ندوۃ العلماء کی امداد کے لئے تحصیل وحصول کے کاموں کی فکر وانتظام کی ذمہ داری ہے۔ مولانا مرحوم کو کتابوں کی طباعت واشاعت کے معاملات سے آگہی پہلے ہی سے تھی۔

انھوں نے عملی زندگی کے آغاز سے ہی پانچویں دہائی کے آخر سے چھٹی دہائی کے نصف تک جو مشغولیت اختیار کی تھی اس میں نظیر آباد لکھنؤ، میں واقع مشرقی اور اسلامی کتابوں کے ایک بڑے مرکز "شبلی بکڈپو" کی ذمہ داری بھی تھی، یہ ایک پرائیویٹ مرکز تھا جو مصری، شامی کتابیں، نیز دارالعلوم اور دارالمصنفین کے تعلق کی کتابوں کا تجارتی مرکز تھا۔ اس کو اول کتب خانہ ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا کلیم احمد بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ شخصی مکتبہ کی حیثیت سے چلاتے تھے، اس کے چلنے میں دشواری اور دیگر اسباب کی بناء پر قابل فروخت ہوا تو مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سنبھالا، لیکن مکتبہ زوال کے راستہ پر آگیا تھا لہٰذا ان کے قابو میں بھی نہ آسکا، انھوں نے اس سے دست برداری اختیار کرلی، اسی درمیان ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اسی جیسے کام کی جگہ مل گئی۔

مجھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف اسی زمانہ میں حاصل ہوا، اولاً شبلی بک ڈپو کے واسطہ سے، کیونکہ اس میں مولانا کلیم احمد بہرائچی کے زمانہ ہی سے آتا جاتا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوڑا جہان آباد ضلع فتحپور کے تھے وہاں ہمارے خاندان کے متعدد افراد کی رشتہ داریاں رہی ہیں، تیسرے ندوۃ العلماء میں مولانا کی تعلیم کے دوران جو رفقاء ان کے قریبی تھے ان میں میرے بڑے بھائی سید محمود حسن اور مولانا محمد ثانی رحمۃ اللہ علیہما بھی تھے۔

ان وجوہ کی بناء پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ہمارے محلہ محمد علی لین میں آنا اور ملنا ہوتا تھا، اس وقت میرے بڑے بھائی محمد ثانیؒ کے مظاہر علوم سہارنپور کے رفیق درس مولانا سیّد محمد مرتضیٰ صاحب نقویؒ بھی وہیں رہتے تھے۔ یہ دو تین دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو بے تکلف عمر اور علمی درسی مشغلہ سے دلچسپی میں وحدت کی بناء پر دوستانہ اور رفیقانہ انداز سے ملتے اور کچھ وقت

گزارتے، مجھے بھی ان مجلسوں میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ اس سے میرا مولانا مرحوم سے عزیزانہ اور قدرے بے تکلفی کا ربط قائم ہوگیا جو ان کے ندوہ العلماء سے متعلق ہوجانے کے بعد قائم رہا بلکہ پختہ ہوا۔ ندوۃ العلماء میں مولانا قاضی محمد معین اللہ صاحب ندوی مدظلہ بھی تھے جن سے ندوہ العلماء میں مرحوم کے تعلیم کے زمانہ میں معاصرت ورفاقت رہ چکی تھی چنانچہ مولانا معین اللہ صاحب نے ان کو اپنا معاون بنالیا۔ مولانا اس وقت شعبہ کے ناظر تھے، اور مولانا مرحوم معاون ناظر مقرر ہوئے۔

مولانا مرحوم نرم خو اور خوش اخلاقی کی صفات کے حامل تھے، سب سے اخلاق وہمدردی سے پیش آتے، وہ باوقار طبیعت کے آدمی تھے لیکن ان کا وقار دوسروں پر بار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برادرانہ دائرہ میں رہتا تھا، ان میں انتظامی صلاحیت بھی تھی، چنانچہ ندوہ کے انتظامی دائرہ میں بھی بعض کام ان کے سپرد کئے جاتے تھے۔ خاص طور پر جن کاموں کا مزاج علمی ہوتا، کچھ عرصہ وہ رواق سلیمانی کے نگراں بھی رہے، مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کے مشاورتی جلسوں کی تیاری کے موقع کے بعض کام ان کے سپرد کئے جاتے تھے، وہ ندوہ کی نصابی کتابوں کی اشاعت کی فکر کرتے تھے، اور ان کے نئے ایڈیشنوں کی ضرورت محسوس کر کے اشاعت کی تجویز کرنے کا کام بھی انجام دیتے۔ ندوہ کے لئے حصول تعاون کے لئے جو حضرات بھیجے جاتے ان کے سلسلہ کے امور میں متعلقہ حضرات کے مشوروں، پھر ناظم صاحب کی اجازت پر ان کے پروگرام کو طے کرنے اور بھیجنے کے کاموں میں ان کی ذمہ داری ہوتی۔

مولانا مرحوم سنجیدہ طبیعت کے تھے لیکن اس کے ساتھ مزاج میں انبساط رکھتے تھے، وہ اپنے رفقاء اور دوستوں سے بے تکلف رہتے تھے، ان میں دینداری ودینی وضعداری کی صفات نمایاں تھیں۔ نماز باجماعت کا اہتمام مسجد

کی پابندی کے ساتھ بیماری کے زمانہ میں بھی حتی الوسع نبھاتے تھے۔ مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ کے والد مولانا عبدالحی صاحب ایک معروف عالم، کانپور میں قائم معروف ملی ودینی ادارہ کے ناظم اعلیٰ تھے، مولانا مرحوم کو دین وملت کی خدمت کا جذبہ وہیں سے ملا تھا، وہ اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نائب اور قائم مقام، پھر ناظم اعلیٰ ہوئے، جس کو ندوہ میں مشغول ہوجانے کے باوجود انھوں نے برابر نبھایا۔ اور اس کے تحت نکلنے والے ایک پرچہ کو "محکمات" کے نام سے نکالتے رہے جو انجمن کے اپنے حلقہ میں زیادہ ترجاتا تھا۔

مولانا نے ندوہ کے بعد دیوبند میں تعلیمی زمانہ گزارا، غالباً اس زمانے میں مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب کے پیچھے بار بار نمازیں پڑھی ہوں گی چنانچہ ان کا لحن ان کے ذہن میں رچ بس گیا تھا جس کا اثر ان کی قرات سے ظاہر ہوتا تھا حتی کہ بعض وقت بعض لوگوں کو شبہ ہو جاتا تھا کہ قاری طیّب صاحب نماز پڑھارہے ہیں۔

مولانا مرحوم مولانا معین اللہ صاحب ندوی ناظر شعبہ تعمیر وترقی ونائب ناظم ندوۃ العلماء کے تعلیمی عہد کے ساتھی ومعاصر ہونے کے سبب ان سے بہت قریب تھے بلکہ تعلق ایک طرح سے دوستانہ کیفیت کا حامل بن چکا تھا، عمر میں بھی یکسانی تھی لہٰذا مولانا مرحوم کی وفات ان کے لئے خاصی محسوس ہونے والی بات تھی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ سے مولانا مرحوم عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے، کچھ تو کوڑا جہاں آباد کے تعلق سے اور کچھ دینی احترام اور قدردانی کی بناء پر اور یہ بات ملاقات پر ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا سے اسفار کے موقعوں پر رخصت کرنے کے لئے ملتے اور تعلق خاطر کے ساتھ رخصت کرتے، حضرت مولانا کے اس سفر کے موقع پر بھی آکر ملے اور رخصت کیا، جب کہ خود ان کے دنیا سے رخصت

اختیار کرنے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے، کسی کو معلوم نہ تھا ان کو سفر آخرت اسی رات پیش آجائے گا جو رات حضرت مولانا کی لکھنؤ سے دہلی کے درمیان سفر میں گزری اسی کی صبح قیام گاہ پہنچنے پر وفات کی رنجیدہ خبر ملی چونکہ اس روز جدّہ کا سفر تھا اس لئے جنازہ میں شرکت بھی ممکن نہ ہوسکی، میں بھی حضرت مولانا کے ساتھ تھا لہٰذا میں بھی محروم رہا۔

اگلی رات ریاض میں گزری وہاں مولانا مرحوم کے ایک بڑے بیٹے مولوی محمد عبدالرشید ندوی سے ملاقات ہوئی، یہ مرحوم کے پسماندگان سے پہلی ملاقات تھی، تعزیت پیش کی۔ فاکس کے ذریعہ دوسرے صاحبزادگان کو بھی لکھنؤ میں تعزیت پیش کی، ان کی وفات ندوہ کے کارپردازوں میں ایک قیمتی شخصیت کا خسارہ ہے اور ان کے محبین کے لئے ایک دوست محب اور محترم عزیز کا خسارہ ہے، یہ خسارہ ایک دوسری طرف قابل قدر شخصیت مولانا مرتضیٰ صاحب ناظر کتب خانہ ندوہ العلماء کے انتقال کے بعد ہونے والے خسارے کے فوراً بعد پیش آیا اس لئے اس کا اثر مزید محسوس کیا گیا۔

مجھ کو اپنے دیرینہ تعلقات کی بناء پر مضمون لکھنا تھا جو سفر کی واپسی پر لکھتا لیکن سفر سے واپسی پر مجھ کو خود اپنے ذاتی گھرانے کی بیماریوں اور حوادث سے گزرنا پڑا اور میں یہ کام فوراً نہ کرسکا۔ اب اس کو انجام دے رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے خصوصی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کے ساتھ خصوصی رحمت ونعمت کا معاملہ فرمائے (آمین)

مولانا مرحوم نے پسماندگان میں چھ صاحبزادگان چھوڑے ڈاکٹر عبد العزیز، مولوی عبد الرشید ندوی، مولوی حافظ عبد الجلیل ندوی، عبد الرحمن، حافظ عبید الرحمن ندوی، اور عبد الحی ثانی، اللہ تعالیٰ ان سب کو ترقی اور اعلیٰ مقامات مرحمت فرمائے۔

(مطبوعہ "تعمیر حیات" ۲۵ اپریل ۱۹۹۶ء)

مولانا سید محمد عبد السمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ

تاثرات و مشاہدات

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب ؒ (جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے دل پر رنج وصدمہ کا احساس تازہ ہو رہا ہے) سے راقم کی واقفیت کم وبیش ربع صدی پر محیط ہے، یعنی میری دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آمد ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء ہی اسکا نقطہ آغاز ہے۔ یہاں آنے کے غالباً دو ایک سال بعد سے ہی ہم سائگی حاصل رہی، ظاہر ہے کہ پڑوسی کو جتنا موقع کسی کی خوبیوں اور خامیوں کے جاننے کا ملتا ہے اور کسی کو اتنا نہیں ملتا، میں اپنی اس طویل اور دیرینہ ہمسائیگی والی معلومات کی بناء پر کہتا ہوں کہ مولانا میں یوں تو بہت سی خوبیوں کا اجتماع تھا، ان سب کے ساتھ میرے نزدیک ان کی سب سے اہم خوبی انکی کم گوئی اور غض بصر تھی میں نے انھیں یاوہ گوئی کرتے نہیں دیکھا اور نہ غیر سنجیدہ انداز کی گفتگو کرتے دیکھا، بس بقدرِ ضرورت، نہایت دھیمی آواز اور متانت سے بات کرتے، ہمیشہ نگاہ نیچی رکھتے، بضرورت اوپر اٹھاتے، نہ صرف چال ڈھال میں بلکہ چہرہ اور قد و قامت میں بھی وقار اور وجاہت جھلکتی تھی۔

دینی جذبہ اور خشیت الٰہی کے ثبوت میں مولانا کی مثالی نماز باجماعت کی پابندی پیش کی جاسکتی ہے، سخت سردی گرمی اور برسات میں بھی جماعت، وہ بھی مسجد کی نماز باجماعت نہیں چھوٹتی تھی، آخر میں گھٹنوں کے تکلیف رہنے لگی تھی تو ایک تکیہ مسجد لے جانے لگے تھے (جس پر سجدہ کرنے کی

حالت میں گھٹنوں کو غالباً آرام ملتا ہوگا)۔

دینی افتاد طبع ہی کی بنیاد پر اپنے لڑکوں کو قرآن مجید حفظ کرایا اور دینی تعلیم دلوانے کا اھتمام کیا، چنانچہ بحمداللہ تین لڑکے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تکمیل علوم دینیہ کی سند لینے میں کامیاب ہوئے اور ایک صاحبزادے مولوی محمد عبدالرشید ندوی سلمہ نے جامعۃ الامام محمد بن سعود، ریاض (سعودی عرب) میں کئی سال تک دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کرلینے کے بعد تعلیم حاصل کی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بھی عصری علوم کے امتحانات پاس کئے۔

خود موصوف نے ہندوستان کے دونوں مراکز علوم دینیہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فیض اٹھایا، مقدم الذکر میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک مستفیض ہوتے رہے، وہ زمانہ تحریک آزادی کے شباب اور علمائے دین کی جنگ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لینے کا تھا، مولانا موصوف نے بھی غالباً دارالعلوم دیوبند کے اپنے بعض اساتذہ کی راہنمائی یا ان کی طرف سے حوصلہ افزائی کی بناء پر اس میں حصہ لیا (جیسا کہ مولانا مرحوم کی ایک خود نوشت یادداشت سے معلوم ہوا)

اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو اولاد بھی صالح وسعادتمند عطا فرمائی، ایک صاحبزادہ کی سعادتمندی کے بدولت مولانا کو عمرہ وزیارت حرمین شریفین کا شرف بھی حاصل ہوا مولانا کے صلاح کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ وفات سے چند گھنٹہ پہلے عشاء کی نماز باجماعت مسجد میں ادا کی اور اگلا وقت نماز (فجر) آنے سے قبل ہی اپنے حقیقی مولا سے جاملے گویا اپنے ذمہ کوئی فرض نماز باقی نہیں چھوڑ گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً سابغۃً کاملۃً

مطبوعہ "محکمات" جنوری تا مارچ ۱۹۹۶ء

جناب مولانا سید محمد عبدالسمیع صاحب ندویؒ

پروفیسر وصی احمد صدیقی
معتمد مالیات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

انسانی وصف و کمال میں جو چیز مجھے ہمیشہ محبوب رہی وہ نرم دلی اور نرم نگاہی ہے، چاہے کوئی کتنا ہی بڑا عالم ہو اگر اس وصف سے محروم ہے تو پھر میرا حصہ دور کا جلوہ ہی رہا ہے، قریب جانے کی خواہش دل میں نہیں پیدا ہوئی۔

ہمارے مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی مرحوم و مغفور اسی قبیلہ کے فرد تھے اور جب ان کے صاحبزادے نے مجھ سے فرمائش کی کہ ان سے متعلق کچھ لکھوں تو یہ میرے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوا۔ اپنے محترم بزرگ نظر کے سامنے آگئے جن سے دفتر کے علاوہ ملاقات عام طور پر مسجد کے دروازہ پر ہوتی، آج بھی مولانا ذہن میں اپنے چھوٹے سے تکیہ کے ساتھ آتے ہیں۔ جسے وہ دوران نماز گھٹنوں کے نیچے رکھتے تھے پیری نے جسم میں کوئی خم پیدا نہیں کیا تھا اور توقیر کی صورتِ مجسم لگتے تھے۔

پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے حضرت نظام الدین اولیاء کے عرس کا حال ریڈیو پر آرہا تھا، اس کی ابتدا اپنے صوفی شاعر حضرت امیر خسرو کے اس شعر سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے مرشد کے وصال پر کہا تھا ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

جب یہ شعر سنا تو خیال آیا کہ اپنی زندگی کی شام بھی تو آگئی ہے اب گھر ہمیں بھی تو چلنا چاہئے۔ کار منصبی کو تمام کیا، یاران نجد سے رخصت ہوئے،

رخت سفر باندھا اور اپنے دیار جسے ختن کہیں یا تتار، پہنچ گئے، مسجد کے زیر سایہ اپنے خرابات کو آباد کیا اور کوئے جاناں کی سیر کو نکل گئے۔

دیکھا کہ زمانے کے سرد و گرم نے اس علم کے مرکز پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے. غالب نے کہا تھا۔

بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

میخانہ کچھ اس سے زائد آباد نکلا جیسا کہ چھوڑ کر گیا تھا۔ رندان تشنہ کام جتنا بھی پئیں خم شراب کہنہ سے ویسے ہی بھرے ہیں، ایک بڑے ادارہ سے آیا تھا. علمی فضا طبعیت میں رچی بسی تھی مگر یہاں کی بات کچھ اور تھی بڑا فرق پایا۔ یہاں تحصیل علم برائے ذریعہ معاش نہ تھا گو دین و دنیا دونوں میں سرفرازی کا باعث تھا۔

لفظ "تھا" محض جملہ کی ساخت کی بناء پر لکھ گیا ورنہ علم کا یہ سمندر تو ویسے ہی موجیں لے رہا ہے ماضی - حال - مستقبل، سب پر محیط۔

میں اپنے اس ادارہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے نیوٹن کا انکسار پسند نہیں کروں گا جنھوں نے کہا تھا کہ علم کے سمندر کے کنارے خزف ریزے چن رہا ہوں. دنیا کے اس سب سے بڑے سائنس داں اور ریاضی داں کے لئے یہ انکسار رومانٹک لگتا ہے، مگر یہاں تو غوطہ لگانے والوں کو موتی ملتے ہیں۔

پھر وہ بزرگ حضرات یاد آئے جنکی پیری میں مانند سحر رنگ شباب تھا اپنے مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب مظاہری نقوی مرحوم کا ساتھ ہوا تھا جن کے دربار میں روز حاضری ہوتی تھی۔ کتب خانہ کو ان کا دربار ہی کہوں گا مگر یہ کسی ظل سبحانی کا دربار نہ تھا، یہاں تو علم کے جویا اپنے آباء کی کتابوں کا مطالعہ کرنے اور عصری علوم سے شناسائی کے لئے آتے تھے، یہاں بھر بھر کے جام بٹتا تھا، ہم تو بقول ان کے مرشد زادے تھے، پوری توجہ ہم پر تھی۔

یہ ساتھ لمبا نہ رہا لیکن جتنے دن رہا اس کی خوشگوار یادیں دل میں ہمیشہ

تازہ رہیں گی۔ ان کے انتقال کے بعد کتب خانہ جانے کی خواہش ختم ہوگئی.
مرحوم ناظر کتب خانہ کا نام اعلی علیین کے رجسٹر میں درج ہوگا۔ مولانا نے جاتے ہی حاضری لگادی ہوگی۔ ابھی ندوہ اپنے علمی اور میں اپنے ذاتی نقصان کا ماتم کر ہی رہا تھا کہ " فلاں نماند " کی فہرست میں مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی بھی آگئے۔

زمیں کھاگئی آسماں کیسے کیسے

مولانا بھی میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے اور اس ناطے اسی محبت کا تعلق رکھتے تھے جو پرانے وضعدار بزرگوں کا شیوہ تھا۔ شعبہ تعمیر وترقی دفتر نظامت کے بالکل سامنے ہے۔ مرحوم اپنے شعبہ میں کرسی میز سنبھالے دور سے نظر آتے تھے. نہ معلوم کون کون سے کام ان سے وابستہ تھے؟ یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ندوہ میں جہاں بھی عقدہ مشکل کی کشود کی ضرورت ہوتی تھی لوگ مولانا کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تھے۔

میرے کمرے کے دروازے اور کھڑکی سے وہ نظر آتے تھے اور لگتا تھا کہ سرسیدؒ کرسی پر فروکش ہیں، ہر وقت لوگوں سے گھرے ہوئے، چاہے وہ محصل ہوں، چاہے سفراء ہوں، چاہے اساتذہ ہوں، دفتر میں کوئی بھی آئے، چاہے وہ نکاح نامہ کا ترجمہ وتصدیق کرانے والے ہوں چاہے ویزا اور پاسپورٹ سے متعلق کام کرانے والے ہوں، مولانا کی وجیہ شخصیت کے سبب سب سے پہلے ان ہی سے ٹکراتے تھے، مولانا کی آنکھیں بڑی اور سرخی مائل تھیں جو لوگوں کو مرعوب کردیتی تھیں، لیکن کسی نو وارد کو کیا معلوم کہ ان کے سینہ میں کتنا گداز دل ہے، لوگ آنکھوں کی سرخی سے مرعوب صرف کام کی باتیں کرتے تھے۔

پھر چند دنوں کے لئے مولانا دفتر نظامت آئے۔ وہ نظامت کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے بھیجے گئے تھے، پتہ نہیں مولانا نے کیا اصلاحات کیں

لیکن ان کی آمد میرے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوئی کیونکہ اب ان سے گفتگو کے زیادہ مواقع ملنے لگے۔ گفتگو کے موضوعات مختلف ہوتے تھے عرب ممالک معاشی حالات اتنے بہتر ہونے کے باوجود کیوں ذلیل وخوار ہیں، ہندوستان میں سر اٹھا کر رہنے کے لئے مسلمان طالب علموں کو برادران وطن سے کتنا اور زیادہ محبت کرنا ہے، ندوہ کے طالب علموں اور دیگر اداروں کے طالب علموں میں کیا چیز مشترک ہے اور کیا چیز مختلف۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کب لوٹے گی، یہ باتیں اور دلچسپ ہوجاتی تھیں جب جاڑے ہوتے تھے اور مولانا دفتر کے باہر دھوپ میں بیٹھے ہوتے تھے، فرائض منصبی بھی انجام دیتے جاتے تھے اور گفتگو بھی چلتی جاتی تھی، کیسی شگفتگی اور بے ساختگی ان کی زبان میں تھی۔ واقعی ان سے بات کرنا سعادت اور نعمت کا درجہ رکھتی تھی۔

ہمارے مولانا، مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب مظاہریؒ کے پڑوسی تھے، مفارقت کی زیادہ تاب نہیں لائے اور چل دیئے۔ پہلی منزل ڈالی گنج کا قبرستان ہوئی جو ندوہ کا گنج شاگاں ہے۔ جنت میں بھی پڑوسی ہوگئے، جنت کی ساری نعمتیں اللہ کے ان مقبول بندوں کے لئے ہونگی مگر دل انکا ندوہ میں ہوگا۔ جہاں عمر عزیز کا بیشتر حصہ گزار دیا۔ ایک کو کتب خانہ کی فکر ہوگی، دوسرے کو شعبہ کی۔

میں بہت سی باتیں لکھ گیا جو عمومی تھیں، اس لطف خاص کا کیا ذکر کروں جو صرف میرے لئے تھا، ہمیشہ یہ فرمائش بلکہ فہمائش کہ تم لکھتے کیوں نہیں ہو، پتہ نہیں کیسے مولانا کو یہ حسن ظن پیدا ہوگیا تھا کہ یہ کام میرے علم اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ مرحوم والد صاحب کی مثال دے کر شرم دلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لائق میراث پدر کیونکر ہو؟ تمہارے باپ اتنے لائق، تمہارے ماموں اتنے بڑے ادیب! آخر تمہیں کیا ہوا

ہے؟ عرض کیا مولانا نکو ناموں کے بدنام کنندہ بھی تو ہوتے ہیں لیکن میرے مشفق اور مہربان یہ بات سننے کو تیار نہ ہوتے۔

ایک دن مولانا معین اللہ صاحب ندوی مدظلہ العالی نے فرمایا کہ تاریخ دعوت وعزیمت کا خلاصہ کرو۔ اس سے پہلے وہ پرانے چراغ جلد سوئم، کاروان زندگی جلد پنجم اور شرق اوسط کی ڈائری پر میرے مضامین دیکھ چکے تھے اور پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ میں اپنے مخدوم مولانا کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں جو ظلوماً جھولاً ہوں اس بار امانت کو کیسے اٹھاؤں؟ کہنے لگے کہ تمہیں بہت صحیح آدمی نے بہت صحیح ہدایت دی ہے، یہ کام تم بہت اچھا کرسکتے ہو، بس اب شروع ہو جاؤ۔ جب "تعمیر حیات" کا نیا شمارہ آتا تو مولانا فرماتے! ہاں پڑھ لیا۔ کچھ اور نہیں کہتے تھے، مگر مہربان چہرے کے نقوش میرا انعام ہو جاتے تھے۔ مولانا نے اپنے دیار اور خاندان کے ذکر میں ایک کتاب لکھی۔ کافی ضخیم، مجھے بھی ایک نسخہ عنایت ہوا۔ پڑھا اور چاہا کہ اس پر کچھ لکھوں مگر مولانا نے دلچسپی نہیں لی۔ تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس دونوں سے بے نیاز تھے۔

لکھنے کو تو بہت کچھ تھا، اسلاف اور اخلاف کا ذکر، خاندانی حالات مگر میں نے صرف ان مہربانیوں کا ذکر کیا ہے جو مجھ سے متعلق تھیں باقی اور لوگوں کے لئے جو میرے مقابلے میں زیادہ قریب اور محرم راز درون میخانہ ہیں چھوڑتا ہوں۔ اب یہیں مضمون ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اعلیٰ مراتب سے نوازے، یہی اس گنہگار بندے کی دعا ہے۔

(مطبوعہ "تعمیر حیات" ۲۵ دسمبر ۱۹۹۶ء)

مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب ندوی

کچھ یادیں --- کچھ باتیں

مولانا شفیق الرحمان ندوی
استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب ندوی نے بھی ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کو اس جہان فانی سے رخت سفر باندھ لیا اور احباب کو اپنی جدائی کا غم دے گئے، اللہ والوں کے یہاں اخفاء حال کا بڑا اہتمام ہوتا ہے کہ یہ بڑی خوبی اور انمول جوہر ہے، چنانچہ مولانا نے بھی اخفاء حال کا پورا لحاظ کیا، نہ کسی ڈاکٹر کو زحمت دی، نہ اہل تعلق کو عیادت کا موقع دیا، اور نہ گھر والوں کو خدمت کا، ان کو بھی اس وقت اطلاع ملی جب وہ ہر قسم کی خدمت سے بے نیاز ہوچکے تھے۔

مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب ندوی دار العلوم میں بحیثیت کارکن ۱۹۵۶ء میں تشریف لائے، یہی سال دار العلوم میں بحیثیت طالب علم راقم السطور کی حاضری کا بھی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب شعبہ تعمیر وترقی کا قیام عمل میں آیا تو استاذ گرامی مولانا قاضی معین اللہ صاحب ندوی نے اپنی رفاقت ومعاونت کے لئے روز اول ہی سے مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب ندوی کا انتخاب کیا، اس وقت میں دار العلوم کا ایک ادنی طالب علم تھا، اس لئے قرب وتعلق کا کیا سوال؟ بس یہی بہت تھا کہ میں شعبہ میں ایک باوقار اور پر کشش شخصیت کو آتے جاتے دیکھ لیا کرتا تھا، اس وقت کبھی یہ سوچا نہ ہوگا کہ اس باوقار شخصیت کے قریب ہونے اور ہم کلام ہونے کا بھی شرف حاصل ہوگا، لیکن سولہ سترہ سال کے بعد یہ موقع ہاتھ آیا اور کم وبیش اخیر تک قائم رہا۔

۱۹۷۰ء کے اواخر میں استاد محترم مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی کرم فرمائیوں کے طفیل مجھے دارالعلوم میں آنے اور تدریسی خدمت پر مامور ہونے کا موقع ملا۔ مولانا محمد عبدالسمیع صاحب ندوی ان دنوں رواق سلیمانی کے نگراں تھے، یعنی معاون ناظر شعبہ تعمیر و ترقی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی عزیز طلبہ کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی، اور مولانا حسن و خوبی کے ساتھ یہ نئی خدمت بھی انجام دے رہے تھے، کیونکہ انھیں اس کا سلیقہ بھی تھا اور جذبہ بھی، جب یہ دونوں چیزیں جمع ہوجائیں تو کام میں نکھار آہی جاتا ہے۔

ایک روز مولانا نے مجھے بلایا، پہلے تو مانوس کرنے والی باتیں کیں، اس کے بعد نگرانی قبول کرنے اور معاونت کی فرمائش کی، شروع میں انکار کرتا رہا لیکن جب دارالعلوم کے کام اور مفاد کی بات آجائے تو دارالعلوم کا کون سا فرزند ہوگا جو اس کے لئے قربانی دینے سے گریز کرے گا، یہاں بھی مولانا کی تشکیل کامیاب رہی، کئی سال تک ہم دونوں رواق سلیمانی میں نگرانی کا کام کرتے رہے اس وقت مولانا مرحوم سے قریب ہونے اور ان کی شخصیت سے واقف ہونے کا موقع ملا، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ذہنی و فکری اور عمل و کردار کے اعتبار سے انھیں ایک مکمل ندوی پایا، نظر کی بلندی، فکر کی وسعت اور سیرت کی پاکیزگی میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے، دوسرے کی بات کامل توجہ پورے تحمل کے ساتھ سنتے، اپنی بات منوانے پر اصرار نہ کرتے تھے، سن و سال، علم اور تجربہ ہر اعتبار سے مجھ جیسے کم تر کی بات بلا تامل مان لیتے، جس سے ان کی ذات سے انسیت بڑھی اور لوح قلب پر ان کی عظمت اور بڑائی کا نقش قائم ہوا۔

نگرانی کے سلسلے میں ان کا طریقہ اور انداز ایک مشفق و مربی کا ہوتا تھا کیس بنانے اور پھانسنے کو ناروا گردانتے تھے، کسی طالب علم سے کوئی لغزش

ہوجاتی تو تنبیہ کرتے، ضرورت سمجھتے تو بر وقت سزا بھی دیدیتے تھے، لیکن تنبیہ کرتے وقت یا سزادیتے وقت اس کا بڑا خیال رکھتے کہ طالب علم کی عزت نفس مجروح نہ ہو، شرم وحیا رخصت نہ ہوجائے، ورنہ ڈھٹائی پیداہوجائے گی اور اصلاح کی کوئی امید باقی نہ رہ جائے گی، چنانچہ بعض اوقات کسی طالب علم کے سامان کی تلاشی لینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو اس کمرہ کے سارے لڑکوں کی تلاشی لی جاتی تاکہ کوئی طالب علم مشکوک ہوکر نہ رہ جائے، اور دوسروں کی نگاہ میں گر نہ جائے، تحقیق سے پہلے کسی کو مجرم گرداننے کے وہ قائل نہ تھے اور نہ اس کو درست وبجا سمجھتے تھے، ہلکے پھلکے واقعات کو کیس بناکر جناب مہتمم صاحب کے پاس لے جانے کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ بروقت تنبیہ یا سزاکے ذریعہ اس کو ختم کردیتے تھے، چند سال پوری ہم آہنگی کے ساتھ نگرانی کرنے کے بعد پہلے میں، بعد میں وہ بھی نگرانی سے سبکدوش ہوگئے، لیکن اس زمانے میں انس وتعلق کا جو ربط قائم ہوگیا تھا وہ بعد میں بھی قائم رہا۔

مدارس ملحقہ کے سلسلے میں ان سے بڑی تقویت ملتی تھی، گلولی، ممتاز آباد اور اروئی کاان کے ساتھ سفر بھی ہوا، وہ ان جگہوں کے لوگوں سے واقف تھے اور ان کے مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔ وہاں کے لوگ بھی مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کے فیصلوں کووقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، متعدد بار کا سابقہ ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو مولانا نے اپنے ناخن تدبیر سے ایسا سلجھایاکہ حیرت ہوئی۔

انتقال کے چند ہی روز پہلے کی بات ہے، بذریعہ جیپ کالپی، اُرئی، ممتاز آباد، اور گلولی کا سفر ہوا۔ مولانا کے ہمرکاب راقم السطور کے علاوہ استاذ محترم ماسٹر اطہر حسین صاحب اور برادرم مولانا حسب اللہ صاحب تھے، شب میں قیام کالپی میں ہوا، قیام گاہ سے مسجد کچھ فاصلے پر تھی اور کس قدر ویرانے

میں بھی، نماز کے بعد مسجد مقفل کردی جاتی، پھر دوسرے وقت اذان دینے کے لئے تالا کھولا جاتا، اخیر شب میں مولانا کنجی لے کر مسجد روانہ ہوگئے تالا کھل نہ سکا مولانا نے باہر ہی کھلے میدان میں نماز شروع کردی، دسمبر کا مہینہ اور شب کا آخری حصہ مولانا کو وہیں ٹھنڈک لگ گئی، میں نے مولانا مرحوم کو خوش اوقات پایا ہے نگرانی کا زمانہ ہو یا بعد کا، حضر ہو یا سفر اخیر شب میں بیدار ہوتے، نماز تہجد کے علاوہ اوراد ووظائف کا بھی معمول تھا انھیں دیکھ کر کبھی کبھی ناچیز کو بھی توفیق ملی۔

مولانا سید محمد عبد السمیع صاحب ندوی ندوہ کے ایک لائق فرزند تھے، ان کی ایک خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ ایک طویل عرصہ تک انہیں ندوہ کی خدمت کا موقع ملا، واقف لوگ جانتے ہیں کہ مولانا کی یہ خادمانہ حیثیت محض رسمی اور خانہ پری کی نہیں تھی بلکہ جذبہ دروں کی تسکین کا سامان تھی، ندوہ کی تحریک کو وہ وقت کی ضرورت سمجھتے تھے اور اس کی فکر کی نشر واشاعت اور تبلیغ وتدریج کو اہم ترین خدمت سمجھتے تھے، چنانچہ وہ اپنے مفوضہ کام کو پوری لگن، تندہی اور ذوق وشوق سے کرتے تھے۔ دفتری اوقات کے علاوہ بھی وہ اس کی فکر وتدبیر میں غلطاں رہتے، بالخصوص مالیات کی فراہمی کے سلسلے میں جو بھی مفید نظر آتا، اس سے رابطہ کرنا، ترغیب دینا، ضرورت کا احساس دلانا، یہاں تک کہ ضروری ساز وسامان کے ساتھ سفر پر اسے روانہ کردینا، یہ معمولی کام نہ تھا وقت گزرنے کے ساتھ ان کی کمی کا احساس بھی بڑھتا جائے گا۔

ایک اچھے منتظم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مولانا ایک اچھے قلم کار بھی تھے، ان کا قلم پختہ اور تحریر میں دل آویزی تھی، ماہنامہ "محکمات" کے صفحات اور "قصبہ کوڑا، تاریخ وشخصیات" اس کے شاہد عدل ہیں، گزشتہ کئی برسوں سے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے کے لئے تعزیتی قراردادیں وہی تیار

کرتے تھے جو اختصار وجامعیت کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں، ان کے انتقال سے دارالعلوم اپنے ایک لائق فرزند اور مخلص کارکن سے محروم ہوگیا، اللہ تعالی مرحوم کی خوبیوں کو قبول فرمائے اور ان پر بہترین اجر عطاء فرمائے، اور بشری کمزوریوں (جن سے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں) سے عفو درگذر کا معاملہ فرمائے۔

(آمین)

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ

احساسات و تاثرات اور مشاہدات

ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی
ناظر معہد دارالعلوم، لکھنؤ

جناب مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے میرا پہلا سابقہ غالباً ۱۹۶۰ء میں پڑا جب بحیثیت محصل کے میرا تقرر شعبہ تعمیر و ترقی میں ہوا، اور مولانا شعبہ میں ایک ذمہ دار کی حیثیت سے کام کررہے تھے، میں تقریباً سال بھر تک محصل رہا اس کے بعد تدریس میں لگا دیا گیا۔ اس طرح سال بھر تک مولانا سے میرا معاملات کا تعلق مسلسل رہا۔ میں نے مولانا کو اپنے کاموں میں بہت مستعد پایا۔ سفر سے پہلے جس علاقہ میں بھیجتے وہاں کے پرانے چندہ دہندگان کی فہرست تیار کرواتے تاکہ پرانے لوگوں سے ملنے میں آسانی ہو، علاقہ کے اہم لوگوں کو خطوط دیتے تاکہ ان سے تعاون لیا جاسکے، دوران سفر کوئی ضرورت پیش آتی تو مولانا فوراً توجہ فرماتے اور جو بھی مشکل ہوتی اسے حل فرماتے، جو ضرورت ہوتی اسے مہیا فرماتے۔ تدریس میں لگ جانے کے بعد میرا تعلق مولانا سے منقطع ہوگیا لیکن غالباً ۱۹۶۸ء میں جب رمضان کی دصولی کے لئے مجھے مدراس وبنگلور کا حلقہ دیا گیا تو پھر مولانا سے تعلق پیدا ہوا، اور یہ تعلق دس سال تک ہر رمضان میں مسلسل رہا۔

بعض لوگوں کے نزدیک نوافل، واذکار کسی کی بڑائی کا معیار ہوتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ جو نوافل کا پابند ہوگا وہ فرائض کا بدرجہ اولیٰ پابند ہوگا، لیکن اس کے خلاف بھی مشاہدہ ہوتا رہا ہے کہ بعض لوگ نوافل کا تو

بڑا اہتمام کرتے ہیں لیکن جو ذمہ داری اجرت پر قبول فرماتے ہیں اس میں کوتا ہی کرتے ہیں یہ بات بڑے ہی عیب کی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مولانا میں اس قسم کی کوتاہیاں نہ تھیں، وہ اپنی ذمہ داریاں کماحقہ پوری فرماتے، ساتھ میں نوافل و تطوعات بھی اپنائے رہتے۔

ندوہ میں قیام کے دوران مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور بے تکلف تبادلہ خیالات کا بھی، مولانا کا خیال تھا کہ ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم اسلام کی بات اچھے ڈھنگ سے ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں تک پہنچاتے رہیں، اس سلسلہ میں وہ عملی اقدام بھی کرتے تھے، بعض پمفلٹ ہندی میں شائع کرکے تقسیم فرماتے مولانا طب میں بھی اچھی معلومات رکھتے تھے اور متعدد اہم دوائیں بنانے اور عرق وغیرہ کشید کرنے کا تجربہ رکھتے تھے وہ چاہتے تو اس تجربہ سے دنیا کما سکتے تھے مگر انھوں نے اس علم سے صرف دوسروں کو فی سبیل اللہ فائدہ پہنچایا۔ مولانا کے اندر اسلام پھیلانے، خاص طور سے غیر مسلمین تک اسلام پہنچانے کی تڑپ تھی، خدمت خلق کا جذبہ مولانا کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا، ندوہ کے طویل قیام میں کسی پڑوسی یا ساتھ میں کام کرنے والے یا ماتحتی میں کام کرنے والے کسی ایک شخص سے بھی کبھی معمولی شکایت بھی نہ سنی، اور یہ بڑی بات ہے۔

مولانا ہمیشہ جماعت سے نماز پڑھتے، موسمی شدائد گرمی، سردی، بارش وغیرہ کبھی ان کو جماعت چھوڑنے پر مجبور نہ کرسکیں، ان کے گھٹنے کی ہڈی ذرا ابھر آئی تھی جس سے دو زانو بیٹھنے میں دشواری ہوتی مگر وہ ایک ہلکا تکیہ لے کر مسجد تشریف لاتے اور گھٹنوں کے نیچے وہ تکیہ رکھ کر نماز ادا فرماتے۔ کتنے خوش نصیب تھے کہ آخری رات میں بھی وہ عشاء کی نماز جماعت سے ادا کرکے تشریف لے گئے تھے، اور رات ہی میں اپنے رب سے جا ملے۔ اللہ تعالی مولانا کے درجات بلند فرمائیں اور ان کی بال بال مغفرت فرمائیں۔

حضرت مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

(موتُ العالِم موتُ العالَم)

چودھری وحاج احمد اشرف (ریاض)

آج سے تقریباً پچیس سال قبل بسلسلہ تعلیم ۱۹۷۰ء کے آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء جانا ہوا، مختصر امتحان کے بعد درجہ چہارم میں داخلہ ہوا، چند ہم درس احباب سے تعارف ہونے کے بعد جن سے تھوڑی قربت حاصل ہوئی ان میں سید محمد عبدالجلیل حسینی میرے لئے خاص اہمیت کے حامل رہے جو مولانا حکیم، قاری سید محمد عبدالسمیع ندوی مرحوم ومغفور، ایڈیٹر ماھنامہ " محکمات " وجنرل سکریٹری جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور کے فرزند ہیں۔

قربت کا محرک ایک اور سبب یہ رہا کہ مجھ کو مضمون نگاری کا شوق تھا اور ایک مضمون " قرآن بحیثیت قانون جہاں " مدراس میں ہونے والے مقالہ نگاری کے مقابلہ کے لئے تیار کیا تھا جو خوش خط تحریر نہ ہونے کی بناء پر ارسال نہیں کررہا تھا، کسی خوش خط کی تلاش تھی کہ وہ خوشخط لکھ دے تو اس کو روانہ کردوں، اتفاق سے میں نے سید محمد عبدالجلیل سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے لاؤ میں ہی لکھ دوں، میں نے ان کی تحریر دیکھی، پسند آئی اور وہ مضمون بقلم سید عبدالجلیل خوش خط لکھوا کر مدراس روانہ کردیا، اور ماشاء اللہ وہ EXCELENCE AWARD غیر معمولی قابلیت کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

پھر اسی طرح دوسرا مضمون " انجمن فردوس ادب " لکھنؤ کے زیر اہتمام

منعقد مقالہ نگاری کے لئے لکھا جو پھر کسی خوشنویس کا محتاج تھا لہٰذا پھر محترم برادرم سید محمد عبدالجلیل حسینی کے دست مبارک سے ظاہری زیب وزینت سے آراستہ ہوا اور الحمد للہ یہ مضمون بھی تمام مقالہ نگاروں کی کاوشوں سے فوقیت لے گیا۔ اور اس طرح میری کاوش اور سید محمد عبدالجلیل حسینی کی سعی ایک دوسرے سے مزید قربت کا سبب بنتی رہی پھر ایک مثل " بچوں سے تعلق ماں باپ تک رسائی کا آسان ذریعہ ہے " کے مصداق میرا تعلق ان کے والد گرامی سے بھی استوار ہوگیا۔

لہٰذا ہماری پہلی مختصر ملاقات اور گفتگو مولانا سید محمد عبدالسمیع صاحب ندوی مرحوم ومغفور سے "انجمن فردوس ادب " کے زیر اہتمام منعقد سیرت نبوی پر اول آنے والے مضمون کے سلسلہ میں ہوئی، موصوف مجھے دارالعلوم کے " پورٹیکو " میں ملے میں نے حسب عادت سلام کیا اور احتراماً نیچی نگاہ کرکے اور دامن بچا کر چلدیا، چند قدم ہی چلا تھا کہ مولانا کی آواز پہلی بار مجھ سے مخاطب تھی " وھاج " مجھے یقین نہیں آیا لیکن پلٹ کر دیکھا تو واقعتہً انھوں نے ہی مجھے آواز دی تھی اور وہ مجھے ہی بلا رہے تھے۔ میں ان کے پاس گیا تو وہ فرمانے لگے : آؤ تم سے کچھ بات کرنی ہے پھر وہ قریب ہی اپنے آفس میں لے گئے اور کہا بیٹھو، پھر مجھ سے یوں مخاطب ہوئے :

تم مضمون لکھتے ہو ؟ میں نے کہا : جی ہاں

تمہارا ہی مضمون اوّل آیا ہے ؟ میں نے جواب دیا : جی ہاں

کیا جلیل نے بھی لکھا تھا ؟ میں نے کہا : نہیں ! لیکن مضمون خوشخط اسی نے نقل کیا تھا۔

پھر مولانا نے کہا اچھا تم اپنا وہ مضمون دینا ہم " تعمیر حیات " میں چھپوادیں گے، جب بھی تم کوئی مضمون لکھنا تو ہم کو دکھانا۔

یہ تھی مولانا سے میری پہلی ملاقات، تھی تو چند منٹ کی لیکن اس نے

میری فکر وخیال کو بالکل بدل دیا، پہلے میں سمجھتا تھا، بلکہ دوسرے تمام ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ مولانا بہت جلالی اور غصہ ور ہیں، پاس جاؤگے تو پٹائی کردیں گے، لیکن اب محسوس ہوا کہ مولانا ایک ہمدرد، مشفق اور محبت کرنے والے انسان ہیں، ان کو اپنے بیٹے کے دوست سے بھی وہی ہمدردی اور محبت ہے جو ایک مربی اور عزیز کو اپنے بیٹے سے ہو سکتی ہے۔

کچھ دنوں بعد انہوں نے دوبارہ مضمون کا مطالبہ کیا، میرے پاس اس کا مسودہ تھا لیکن وہ صاف نہیں تھا، خراب تحریر کی بناء پر میں نے انہیں نہیں دیا، سوچا: "انجمن فردوس ادب" سے لاکر دیدوں گا، یہی بات میں نے مولانا سے کہدی، لیکن جب میں "انجمن فردوس ادب" گیا تو اس کے ذمہ داران نے کہا کہ وہ ہماری پراپرٹی ہے اس کو ہم چھپوائیں گے لہذا وہ مضمون میں مولانا کو نہ دے سکا اور نہ وہ "تعمیر حیات" میں چھپ سکا اور نا ہی "انجمن فردوس ادب" نے اسے چھپوایا، اس طرح وہ مضمون ضائع ہوگیا جس کا مجھے آج بھی بے انتہا قلق اور افسوس ہے۔

مولانا کا چہرہ رعب دار، آنکھیں بڑی بڑی اور سرخ تھیں، آواز گرجدار اور پرُ رعب تھی، اس لئے ہر ایک ان کے قریب جانے سے گھبراتا تھا، لیکن جب ان سے میری قربت بڑھی تو مولانا کی شخصیت مزید نکھر کر میرے سامنے آئی جو ظاہر سے بالکل مختلف تھی، مولانا کا چہرہ پر رعب تھا لیکن طبیعت نہایت نرم اور ہمدردانہ تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ سلیمانیہ ہاسٹل کے نگراں بنے تو میرا اور سب دوستوں کا خیال تھا کہ اب لڑکوں پر آفت آئے گی، ان پر قیامت ڈھائی جائے گی، پھر ہم لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ مسجد میں سلیمانیہ ہاسٹل کے طلبہ کی تعداد اچانک بڑھ گئی ہے، اور شور شرابا کم ہوگیا ہے، لیکن یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سلیمانیہ ہاسٹل کے کسی طالب علم کا نہ تو کھانا ہی بند ہوا، اور نہ ہی کسی لڑکے کو مارا پیٹا گیا،

بلکہ یہ ان کی پُروقار شخصیت کا رعب ہی تھا کہ جو طلباء مسجد سے غائب رہتے تھے وہ مولانا کے بغیر کچھ کہے سنے پابندی سے مسجد جانے لگے، یہی نہیں بلکہ بعض طلبہ مولانا کی دیکھا دیکھی تہجد گذار اور شب بیدار ہوگئے، میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کا یہ وصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت (نصرتُ بالرعب) کی ایک جھلک اور اس کا ایک پرتو تھا جو اللہ تعالی نے آپ کو ودیعت کیا تھا، اسی کا یہ اثر تھا کہ لوگ آپ کے چہرہ اور شکل وصورت سے مرعوب ہوجاتے تھے۔

اللہ تعالی نے موصوف کو اس کے علاوہ جن اوصاف حمیدہ سے نوازا تھا وہ نہایت کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں، مثلاً تصنیف وتالیف کا شوق اور اس عمل کو تواتر اور مستقل مزاجی سے انجام دینا، صحافت کا جذبہ جس میں باقاعدگی کیساتھ ایک رسالہ کا جاری رکھنا، جس میں رسالہ کی ادارت، ترتیب وتیاری سے لیکر ارسال وترسیل کی تمام ذمہ داری تک کے فرائض کسی مادی فائدہ اور حصول منفعت کے بغیر انجام دینا، مادر علمی ندوۃ العلماء سے لگاؤ اور ہمدردی جسکا جیتا جاگتا ثبوت ندوہ سے آپ کی آخری لمحات تک وابستگی ہے، اس کے علاوہ دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں الگ ہیں جو آپ جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور، کے پلیٹ فارم سے مسلموں اور غیر مسلموں میں انجام دے رہے تھے، خصوصاً غیر مسلموں کو دعوت اسلام دینا اور ان کو مناسب اسلامی لٹریچر فراہم کرنا، اس نسبت سے بھی مولانا سے ایک بار میرا سابقہ پڑا. تو موصوف نے غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

جب میں لکھنؤ سے دہلی آگیا تو چند کتابیں جو میں نے موصوف کے گھر پر دیکھی تھیں کسی مضمون کی تیاری میں ان میں سے کسی ایک کی مجھے ضرورت محسوس ہوئی، میں نے مولانا کو لکھا تو مولانا نے اس کتاب کے علاوہ دیگر کئی کتابیں مجھے ڈاک سے ارسال کردیں اور ساتھ ہی ایک خط بھی تحریر کیا

کہ اگر اور کوئی کتاب درکار ہو تو لکھنا بھیجدوں گا، اور تمہارے قریبی پڑھے لکھے حضرات پڑھنا چاہیں تو ان کے پتے مجھے لکھدینا میں ان کو بھی روانہ کردوں گا، مجھ کو اس بات پر حیرت ہوئی اور تعجب بھی ہوا کہ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ مولانا کسی سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رکھتے لیکن مولانا تو اس کے بالکل برعکس نکلے۔

اللہ تعالیٰ موصوف کو ان کے نیک اعمال، دینی خدمات، اور غیروں کی مدد وہمدردی اور خوش اخلاقی کی بناء پر کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور دائمی سکون واطمینان عطا فرمائے، اور ان کی نیک اور پاکباز اولاد کو ان کا بہترین ترکہ اور صدقہ ٔ جاریہ بنائے۔ (آمین ثم آمین)

یہ ایک مختصر سی تحریر ہے جو موصوف کی یاد میں لکھی گئی ہے، اور نہ جانے ان کی اسی طرح کی کتنی باتیں یاد آتی رہیں گی، اللہ تعالیٰ ہمارے اندر بھی اسی طرح کی ایک آدھ خوبی پیدا کردے جس کی وجہ سے ہمارے خاتمہ کے بعد ہمیں بھی کوئی یاد رکھے اور ہماری مغفرت کی دعاء کرے۔ (آمین)

"آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے"

مولانا حسب اللہ ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

شہرت اور نام ونمود کی خواہش انسان کی ایک ایسی فطری کمزوری ہے جس سے شاید ہی کوئی شخص محفوظ ہو، تاہم یہ دنیا ایسے افراد سے کبھی خالی نہیں رہی ہے جو دنیا کی حرص وہوس سے بے نیاز اور کسی صلہ کی خواہش یا ستائش کی تمنا کے بغیر ایسے مشاغل میں لگے رہتے ہیں جو اہل دنیا کی نگاہ میں کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے اور نہ ان کے نزدیک لائقِ اعتناء وباعثِ کشش اور لائقِ تحسین ہوتے ہیں، ایسے لوگ قناعت پسندی کے باوجود بڑی پرسکون زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ان کا مقصد حیات ہوتا ہے۔

ایسے ہی لوگوں میں حکیم مولانا محمد عبد السمیع صاحب ندوی بھی تھے، مولانا ایک اچھے عالم دین ہونے کے ساتھ ہی ایک اچھے حکیم بھی تھے، دار العلوم سے منسلک ہونے کے بعد اس فن کو بطور پیشہ کبھی نہیں استعمال کیا بلکہ دوست احباب اور ضرورت مندوں کو نسخے بلا کسی معاوضہ کے لکھ کر دیا کرتے تھے حالانکہ آپ کو پیسوں کی شدید ضرورت ہوتی لیکن ان کی قناعت پسند طبیعت کو پیسہ لینا گوارہ نہ ہوتا، آپ نے ندوہ کی قلیل یافت ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور کبھی دوسرے ذرائع معاش کی طرف توجہ نہ کی حالانکہ علم دین کے ساتھ ساتھ مختلف ایسے فنون سے کماحقہ واقف تھے جنھیں اگر بطور پیشہ اختیار کرتے تو آپ کا معیار زندگی بڑا اونچا ہوتا، لیکن آپ اپنی

عالمانہ شان پر مضبوطی سے قائم رہے اور اسلاف کے طرز زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنائے رکھا اور اپنی پوری زندگی ندوہ کے لئے وقف کردی۔ مولانا نے اس مرکز علوم وفنون کی خدمت کو اپنی اخروی کامیابی کا محور ومقصد بنایا، اور دین کے فیوض وبرکات سے خود اپنی زندگی قابل رشک بنائی اور اپنی تمام اولاد کو بھی علم دین سے آراستہ کیا جو معرکہ حیات میں کامیاب وکامران زندگی کے نمونے ہیں۔ اور آخر میں یہیں سے اپنے اس آخری سفر پر روانہ ہوئے جس سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

مولانا کو میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے لے کر تدریسی زمانہ تک یکساں پایا، سنجیدگی ومتانت اور سادگی میں اس وقت سے اب تک کوئی فرق نہیں پایا، میں نے مولانا کی نشست وبرخاست، گفتار وکردار کو نہایت پروقار اور عالمانہ پایا، اپنے کام ودھن کے بڑے پکے، دارالعلوم کے مختلف شعبہ جات سے انکی وابستگی رہی، ہر شعبہ میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں نہایت چاق چوبند اور بڑے مستعد اور کامیاب رہے، میری طالب علمی ہی کے دور میں دارالعلوم میں شعبہ تعمیر وترقی کا ایک محدود شکل میں قیام عمل میں آیا، مولانا باضابطہ اس شعبہ سے منسلک ہوگئے، اور شعبہ کے روح رواں جناب مولانا معین اللہ صاحب ندوی کے دست راست بن کر کام کا آغاز کیا اور اپنے حسن کارکردگی اور پیہم کوششوں اور بہترین انتظامی صلاحیتوں سے اس شعبہ کے دائرہ کار کو بڑی وسعت اور آفاقیت عطا کی۔ چونکہ مولانا کا تعلق شعبہ تعلیم سے میرے زمانہ طالب علمی میں نہیں تھا اس لئے آپ کے ساتھ میرا ربط صرف علیک سلیک تک ہی محدود رہا لیکن ظاہر سی بات ہے میں بھی اسی ماحول میں سانس لے رہا تھا جہاں مولانا سرگرم عمل تھے ہم دونوں کی سرگرمیاں اپنی اپنی سمت میں اسی چہار دیواری کے اندر جاری وساری تھیں اس لئے بہت قریب سے نہ سہی دور ہی سے مولانا کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع

بہر حال ضرور ملتا تھا، پھر جب ۳۰ - ۳۲ سال کے طویل عرصہ کے بعد مادر علمی کی خدمت کی مجھے سعادت ملی تو اب نسبتاً پہلے کے مقابلے کچھ قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا اب شانہ بشانہ بیٹھنے کا بھی اتفاق ہوا، کسی نہ کسی معاملے میں گفتگو کا شرف حاصل ہوا مولانا کا انداز گفتگو اور لب ولہجہ ہمیشہ محبت آمیز، ہمدردانہ ومشفقانہ پایا۔

آپ علم دوست مردم آمیز اور زندہ دل انسان تھے، کم گوئی تو آپ کی فطرت میں داخل تھی، مولانا کی سب سے بڑی خوبی بے ضرورت لب کشائی سے پرہیز، رفتار وگفتار میں سنجیدگی ومتانت اور پست نگاہی ہے، نیز معاملات میں صفائی، عبادات میں انہماک واقبال علی اللہ، باجماعت نمازوں کی ادائیگی کا التزام، عبادات ومعاملات میں سنت کی حتی الامکان پیروی اور رعایت مولانا کی اعلیٰ خصوصیات میں سے ہیں، اکثر مولانا اذان ہوتے ہی اور کبھی قبل از اذان مسجد پہونچ جاتے، اس پابندی میں نہ کڑاکے کی سردی مانع بنتی نہ سخت گرمی اور نہ کوئی ناگزیر وہنگامی ضرورت آڑے آتی، ۔ میرے علم ودانست کے مطابق کبھی تکبیر اولیٰ آپ کی فوت نہ ہونے پاتی تھی ادھر چند سالوں سے غالباً گھٹنوں میں زیادہ تکلیف کی وجہ سے ہر نماز میں اسپنج یا کپڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا گدا لیکر مسجد آنے لگے تھے جسے گھٹنوں کی جگہ رکھکر نماز ادا کرتے تھے، آج بھی مولانا کا بغل میں وہ چھوٹا سا گدا دبائے مسجد کی طرف تیز گام مگر نگاہیں نیچی کئے ہوئے آنے جانے کا منظر آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے اور مرحوم ومغفور کی یاد تازہ کر رہا ہے ۔

آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے

مولانا کے لباس میں بڑی سادگی ہوتی اس سادگی کو نہ تو موجودہ دور کی تنوع پسند زندگی متاثر کرسکی اور نہ خوشحالی اور فارغ البالی مغلوب کرسکی حالانکہ اب مولانا کا حال ماضی کے مقابلہ معاشی طور پر زیادہ خوشحال اور فارغ البال تھا۔

آپ کے تمام صاحبزادے اندرون ملک اور بیرون ملک برسر روزگار ہیں۔ لیکن آپ کی افتاد طبع کچھ ایسی تھی کہ کوئی چیز آپ کو جلد تسخیر نہ کرپاتی تھی، مولانا کے ساتھ میرا بہت کم تعلق رہا، زمانہ طالب علمی سے اب تک کم آمیزی کی صورت حال یکساں رہی اس لئے ان کے متعلق میری معلومات کا دائرہ نہایت محدود اور ناقص ہے، میں نے جو کچھ اوپر پیش کیا ہے اس کا تعلق ان کی چلتی پھرتی زندگی کے مشاہدے سے ہے اس لئے مزید گہرائی کے ساتھ ان کے بارے میں خامہ فرسائی میرے محدود علم سے باہر ہے۔

آخر میں میں اپنی بات مولانا کے سفر آخرت پر جانے سے صرف ایک ماہ پیشتر ان کی زیر امارت کئے ہوئے ایک سفر کی سرگذشت پر ختم کرونگا۔

دسمبر ۱۹۹۵ء کا پہلا ہفتہ تھا، مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی کی امارت میں ندوۃ العلماء کا ایک وفد اروئی ضلع جالون کے لئے صبح نو بجے دارالعلوم سے روانہ ہوا۔ یہ وفد مولانا کے علاوہ مولانا شفیق الرحمان صاحب ندوی، پروفیسر اطہر صاحب اور راقم الحروف پر مشتمل تھا۔ ہمارا وفد کالپی ڈھائی تین بجے کے قریب پہونچا، کالپی کے نزدیک مولوی محمد فاروق صاحب قاسمی جن کی دعوت پر ہمارا یہ سفر ہوا تھا لب سڑک ہمارے لئے چشم براہ تھے، ہم ان کو لئے سیدھے کالپی جامع مسجد پہونچے، ظہر کا وقت اخیر ہورہا تھا، ہم نے نماز ظہر ادا کی، نماز سے فراغت کے بعد مولانا کے کچھ جاننے پہچاننے والوں نے بڑے اصرار اور محبت کے ساتھ ناشتے چائے کی پیش کش کی، ہم نے ان کے خلوص کی قدر کرتے ہوئے ان کی چائے کی دعوت قبول کرلی اور جلد ناشتہ سے فارغ ہوکر منزل مقصود کے لئے روانہ ہوگئے، اروئی عصر کے کچھ قبل پہونچے وہیں دن کے کھانے کا انتظام تھا، مولانا عبدالسمیع صاحب نے اپنے معمول کے مطابق ایک بڑے ناشتہ دان میں کافی مقدار میں مرغ کا گوشت اور پراٹھے گھر سے پکواکر اپنے ساتھ لے لئے تھے، جب ہم لوگ اپنے میزبان کے

دسترخوان پر بیٹھے تو مولانا نے اپنا ناشتہ دان منگایا اور پہلے اپنے ناشتہ دان کا سالن اور پراٹھے ہمارے برتنوں میں رکھے، کھانے سے فارغ ہو کر عصر کی نماز مولوی فاروق صاحب کے مدرسہ میں ادا کی نماز عصر کے بعد مولانا نے مدرسہ کے کمروں اور اس کے احاطہ کا گھوم گھوم کر بغور معائنہ کیا پھر اگلے پروگرام کے بارے میں دریافت کیا، چونکہ ہمارا یہ سفراس مدرسہ کی مستقل تعمیر نو کے لئے مناسب وموزوں جگہ کے انتخاب ہی کے سلسلہ میں ہوا تھا اس لئے ہم لوگ مدرسہ کے کارکنان اور دیگر مقامی لوگوں کے ساتھ شہر کے باہر اس جگہ کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوگئے جو ان لوگوں نے پہلے سے تجویز کر رکھی تھی ۔ ہم نے وہ خطہ آراضی دیکھا لیکن مولانا نے اسے ناپسند کیا جس کے کئی اسباب تھے، اورمولوی محمد فاروق صاحب سے کہا کہ اورئی شہر میں یا اس سے متصل کسی جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے مقامی بچے آسانی کے ساتھ آمدو رفت کر سکیں یہ جگہ شہر سے دوری کے ساتھ کافی گراں بھی ہے۔ جس کے خریداری کے لئے لاکھوں روپئے کی ضرورت ہوگی پھر تعمیر کا خرچ اس پر مستزاد ہے۔

وہیں سے ہم لوگ کالپی کے لئے روانہ ہوگئے مولوی فاروق قاسمی ہمارے ہمراہ ہوگئے اورئی سے کالپی کی دوری کوئی پندرہ کیلومیٹر ہوگی مغرب کی نماز کالپی کی شاہی مسجد میں آکر پڑھی جو خستہ حال، بے مرمت اور تقریباً غیر آباد اور مسلم آبادی سے بالکل خالی ایک ٹیلے پر واقع ہے، بانی ایک صاحب نسبت بزرگ کو بتایا جاتا ہے، مسجد کے آس پاس افتادہ زمین کافی ہے جو مسجد ہی کی ملکیت ہے، اس پر خود رو پیڑ پودے اگے ہوئے ہیں، اس کے کلید بردار جناب مقسوم علی خاں صاحب ہیں، رات ہو چکی تھی، لکھنؤ کے لئے واپسی ممکن نہ تھی مولانا عبدالسمیع صاحب جو اس قافلہ کے امیر اور ہم سبھوں کے محترم اور بزرگ تھے انکا ارادہ تھا کہ رات مسجد ہی میں گزارلی

جائے لیکن مسجد کے متولی اور موجودہ کلید بردار مقسوم علی خاں صاحب جن کا مکان مسجد سے ایک فرلانگ کی دوری پر واقع ہے جب انکو ہمارے آنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے ہماری میزبانی اور شب باشی کا اپنے یہاں انتظام کیا، ہم مسجد سے ان کے دولتکدہ پر آگئے۔ مولانائے مرحوم سے مقسوم علی خاں کے پہلے سے مراسم تھے مولانا کے تعلق سے شریف میزبان نے بڑی پذیرائی کی اور میزبانی کا حق بہتر طور پر ادا کیا۔ میزبان نے ہماری شب گزاری کے لئے اپنی کوٹھی کا باہری کمرہ خالی کرادیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم نے اپنا اپنا بستر پکڑ لیا، مولانا کا بستر میرے بغل میں تھا۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ میں مسجد چلاجاؤں تاکہ آپ لوگوں کو دقت نہ ، لیکن ہم لوگوں نے باصرار مولانا کو اپنے ساتھ ہی قیام کرنے پر مجبور کردیا، مولانا نے ہماری بات مان لی اور ہمارے ساتھ ہی لیٹ گئے، چونکہ مولانا کا معمول سحر خیزی کا تھا اس لئے وہ مسجد جانا چاہتے تھے تاکہ پوری توجہ اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے معمولات میں مشغول ہوسکیں، مسجد کی چابی مولانا ہی کے پاس تھی جب ہم تمام کے تمام نیند کی آغوش میں چلے گئے تو مولانا چپکے سے اٹھ کر مسجد کے لئے روانہ ہوگئے لیکن مسجد کا دروازہ مولانا سے نہ کھل سکا تو مجبوراً مسجد کے دروازہ ہی پر اپنا رومال بچھا کر اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے اور دسمبر کی نہایت سرد رات مسجد کے دروازہ پر گزاردی جس کی وجہ سے ان کو ٹھنڈ لگ گئی اور آواز بھی کافی متاثر ہوگئی، اور لکھنو واپسی پر بھی دو تین دن تک ان کی طبعیت ناساز رہی۔

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی مرحومؒ کے ساتھ یہ میرا پہلا اور آخری سفر تھا، اس سفر میں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا خاصا موقع ملا اور جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ کسی کے اخلاق و عادات اور اچھائی وبرائی کی پرکھ صحیح طور پر اس کے ساتھ سفر کرنے پر ہوتی ہے۔ اس سفر میں مولانا کے حسن اخلاق

اور رفقاء سفر کے ساتھ عزیزانہ اور بے تکلفی کے برتاؤ سے حد درجہ متاثر ہوا۔ اور پہلے جتنا ہی کتراتا تھا اب اتنا ہی قریب ہوگیا، لیکن صد حسرت وافسوس کہ مولانا کی قربت اور اپنائیت سے تادیر مستفید نہ ہوسکا وہ اس سفر سے واپسی کے بعد جلد ہی ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گئے۔ مولانا کی تحریری قوت وصلاحیت سے میں بالکل ناواقف سا تھا، مادر علمی سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک میں نے اپنے ضلع چمپارن میں یتیم خانہ "بدریہ بتیا" میں تدریسی وانتظامی خدمات انجام دیں پھر وہاں سے دارالعلوم لطیفی کٹیہار پہونچا وہاں کے دوران قیام ایک روز مدرسہ کی ڈاک کے ڈھیر میں رسالہ "محکمات" کے تازہ شمارہ پر نظر پڑی، دیکھا تو وہ میرے ہی نام تھا۔ میں نے سرسری نظر ڈالی، مقام اشاعت مکارم نگر لکھنؤ اور ایڈیٹر محمد عبدالسمیع ندوی دیکھ کر میں نے سمجھا کہ یہ وہ عبدالسمیع صاحب ہیں جو ندوۃ العلماء میں میرے معاصر اور ایک درجہ جونیر تھے، مولانا سید عبدالسمیع صاحب ندوی مرحوم کی طرف قطعی ذہن نہ جاسکا، رسالہ "محکمات" مسلسل میرے نام پابندی وقت کے ساتھ پہنچتا رہا، اس کے مضامین مختلفہ اور اداریہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا۔ اس سے متاثر ہوکر میں نے ایڈیٹر کو شکریہ کا ایک خط روانہ کیا تاکہ کسی حد تک اس احسان سے سبکدوش ہوسکوں، لیکن اخیر اخیر تک مولانا سید محمد عبدالسمیع صاحب ندوی کی طرف ذہن نہ جاسکا۔ ابھی حال ہی میں مولانا کی رحلت کے بعد اس راز کا انکشاف ہوا کہ "محکمات" کے بانی اور ایڈیٹر تو مولانا مرحوم ہی تھے، اپنی لاعلمی پر بڑا نادم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو جامع صلاحیات اور متضاد خصوصیات کا حامل بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ (آمین)

وہ کیا گردوں ہے تو جسکا تھا اک ٹوٹا ہوا تارا

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

معاون ناظر شعبہ تعمیر و ترقی

مکین اشرف صدیقی

متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

ایک مربی کی یاد میں آج میں اپنے پارہ ہائے دل کو یکجا کر کے خراج عقیدت کی چند سطریں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جو میرے اپنے دل کی آواز، نگاہوں کی شہادت اور ضمیر کی صدا ہے، یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ ساز مضطرب کی آواز، دل بیتاب کی صدا، بلبل کی نوا، عاشق کی آہ، مظلوم کی دعا، کسی خارجی محرک کی شرمندہ احسان یا زمان و مکاں کی پابند نہیں ہوتی بلکہ از خود ابلتی اور ظہور پذیر ہوتی ہے۔

قارئین کرام! اس وقت جبکہ مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب مظاہریؒ کے حادثہ وفات کے غموں کے بادل ابھی پورے طور سے چھٹے بھی نہ تھے کہ "شعبہ تعمیر و ترقی کے معاون ناظر" اور ندوۃ العلماء کے مخلص و جانثار فرد، جناب مولانا محمد عبدالسمیع ندویؒ کا حادثہ ارتحال پیش آگیا۔

ناچیز ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ کی صبح نماز فجر کی ادائیگی کے لئے مسجد گیا، نماز ختم ہوتے ہی اس حادثہ کا اعلان کیا گیا۔ اعلان سن کر دل و دماغ پر ایک اور دھچکا

لگا کیوں کہ ابھی ایک زخم بھر نہیں پایا تھا کہ دوسرا زخم پھر لگ گیا، اور ایسا محسوس ہوا کہ موت بھی دقّتِ نظر سے کام لیتی ہے اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔

ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے

قارئین کرام، ویسے تو موت ایک برہنہ شمشیر ہے جسکی زد میں آکر ہر نفس کو سفر آخرت کرنا ہے۔ "کل نفس ذائقة الموت" ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے چاہے وہ بادشاہ ہو یا رعایا ہو، مالدار ہو یا غریب، فلک بوس عمارتوں میں رہتا ہو یا ٹاٹ کی جھوپڑی میں، دولت کے کاشانے میں فرش مخمل پر سوتا ہو یا کلبہء افلاس میں پھٹے ہوئے ٹاٹ پر، بہر کیف جہاں کہیں ہو، جس حال میں ہو، جس عہدے پر ہو، جب وقت آتا ہے تو موت کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے "اذاجاء اجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون"

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت
کلبہء انحلاص میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت ودر میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

اس وقت اہل ندوہ ایک عظیم جانکاہ حادثہ سے دوچار ہوئے ہیں جس کی وجہ سے طلباء دار العلوم، اساتذہ کرام، محبین ندوۃ العلماء اور اہل علم حضرات کے قلوب رنج والم سے ماتم کناں ہیں کیوں کہ ندوہ پر مرحوم کا ناقابل فراموش احسان ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے نکلے ہوئے سورج کا انکار کرنا۔

حیات و کارنامے:

آپ کی تاریخ پیدائش ۲۱ دسمبر ۱۹۲۰ء ہے، ابتدائی تعلیم مدرسہ دار الارشاد قصبہ کوڑا، ضلع فتحپور، (ہسوہ) میں حاصل کی، ۱۹۲۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں یہاں سے فارغ ہو کر دار العلوم دیوبند چلے گئے اور وہاں ۱۹۴۴ء تک تعلیم حاصل کی۔

ندوۃ العلماء میں ملازمت:

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مکتبہ " الجمعیۃ التعاونیۃ" میں بحیثیت منیجر تقرر ہوا، پھر جب یکم اگست ۱۹۵۸ء میں شعبہ تعمیر و ترقی کا قیام عمل میں آیا تو مولانا معین اللہ صاحب ندوی کو اس کا ناظر اور مولانا مرحوم کو ان کا معاون مقرر کیا گیا۔

اس کے علاوہ ۱۹۷۱ء میں جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور کے اعزازی جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس ادارہ نے تقسیم ہند سے پہلے غیر مسلموں میں بڑا کام کیا ہے، آخر وقت تک مولانا مرحوم ماہنامہ "محکمات" کے مدیر اعلیٰ رہے، مولانا مرحوم نے ان تمام ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی دیانت داری کے ساتھ انجام دیا، اس کے علاوہ بھی مرحوم کے بے شمار کارنامے اور قربانیاں ہیں جن سے اہل تعلق بخوبی واقف ہیں، طلبائے ندوہ کے ساتھ آپ کا جو مخلصانہ رویہ تھا وہ لائق تحسین ہے، آپ بہت خوش اخلاق، صالح متقی اور ایک وفا شعار انسان تھے۔ عبادت و ریاضت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، نماز کے بڑے پابند تھے۔ نماز کے لئے جب آپ اپنے مسکن سے مسجد کا رخ کرتے تو دیکھنے میں ایسا لگتا کہ ایک پیاسا انسان ہے جو اپنی تشنگی بجھانے کے لئے ٹھنڈے پانی کے چشمے کی طرف لپکا جا رہا ہو، یہ ٹھنڈا چشمہ کیا ہے؟ نماز ہے جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " الصلاۃ قرۃ عینی "

یعنی نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم آج ہمارے اور آپ کے درمیان موجود نہیں رہے بلکہ وہ ہم سبھوں کو رلاتے اور تڑپاتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملے ۔

ڈھونڈوگے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جانکاہ حادثہ کے اندر صدائے ماتم کی فغاں سنجی ہے، چشم خونبار کی اشک فشانی ہے، اضطراب والم کی لہر ہے، کیوں کہ یہ حادثہ اپنے اندر وہ سامان غم لئے ہوئے ہے جو مرحوم سے عقیدت رکھنے والوں کے قلب وجگر کو پگھلارہا ہے۔ یقیناً آپ کی یاد میں مغفرت کے واسطے خدا کے سامنے جتنے آنسو بھی بہادیئے جائیں، آپ کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور "اذکروا محاسن موتاکم" کے تحت آپ کی مدح وثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ سنج ہوجائیں وہ کم ہے۔

مولانا کا تعزیتی جلسہ مسجد میں بعد نماز مغرب ہوا جس مین مولانا خالد صاحب ندوی، مولانا برہان الدین صاحب، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مشرف اداری جناب مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی اعظمی نے خطاب فرمایا۔ مولانا خالد صاحب ندوی نے مرحوم کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں اور تربیتی اور تبلیغی جدوجہد پر روشنی ڈالی۔ ان کے بعد مولانا مرحوم کے پڑوسی مولانا برہان الدین صاحب استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مرحوم کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دیگر اوصاف وکمالات پر روشنی ڈالی اور اپنے شدید رنج والم کا اظہار فرمایا اور ہم طلبائے ندوہ سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ ان کے بعد مولانا سعید الرحمن صاحب ندوی اعظمی نے خطاب فرمایا، مولانا نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ مولانا مرحوم نے محنت ودیانت اور اخلاص ویکسوئی سے ندوۃ العلماء کی خدمت کی اور اس کے مکتبہ اور مالیاتی نظام کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لئے ہمیشہ سرگرم اور کوشاں رہے، اس کے

علاوہ مولانا نے مرحوم کے اور بھی اوصاف وکمالات اور کارہائے نمایاں کو اجاگر فرمایا جس سے مرحوم کی عظیم صلاحیت اور عبقری شخصیت ہم طلبائے ندوۃ العلما کے سامنے نکھر کر سامنے آگئی اور معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم مختلف میدانوں کے مرد کار اور ایک در شہوار تھے۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء جناب مولانا رابع صاحب حسنی ندوی اسی رات دہلی کے لئے (لکھنؤ میل سے) روانہ ہوئے تھے، آپ حضرات دہلی بھی نہ پہنچ سکے کہ یہ جانکاہ حادثہ پیش آگیا۔ لہذا ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ھ کی صبح دہلی ٹیلیفون کیا گیا، حضرت مولانا دامت برکاتہم کو اس حادثہ کا جیسے ہی علم ہوا آپ نے فوراً دہلی سے ایک تعزیتی فیکس FAX روانہ فرمایا جس میں حضرت مولانا دامت برکاتہم نے اپنے شدید رنج والم کا اظہار فرماتے ہوئے تحریر فرمایا " مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی کا سانحہ ارتحال نہ صرف اہل خاندان کے لئے بلکہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے بھی بڑے خسارے اور رنج والم کا باعث ہے اسی طرح مرحوم کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہوئے دوسرے اوصاف وکمالات کا تذکرہ کیا، جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو مرحوم سے زبردست قلبی لگاؤ اور بہت گہرا تعلق ہے، بعد نماز عصر جناب مفتی ظہور صاحب ندوی دامت برکاتہم نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد ہزاروں سوگواروں نے باچشم نم خدا کی دی ہوئی اس امانت کو ڈالی گنج کے قبرستان میں ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کردیا۔

یقیناً مولانا مرحوم ہم طلبائے ندوہ کو ہمیشہ عالم تصور میں چلتے پھرتے نظر آتے رہیں گے، اور ہر دم دلوں میں سجے بسے رہیں گے اور آپ کے درخشاں کارنامے ہمیشہ ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔ صبح کی برودت، دنوں کی حرارت، باد سحر گاہی کی لطافت، شبنم کی تراوٹ، غنچوں کی چٹک، پھولوں کی مہک اور بجلی کی تڑپ میں آپ کی یادوں کی قندیل ہمیشہ

ضو فشاں رہے گی۔

اللہ تعالٰی آپ کی قبر کو نور سے بھردے، آپ کی مرقد کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش سے سیراب کرے، اور آپ کے درجات بلند کرے، اور انبیاء، صدیقین، شہداء، اور اولیاء کے جوار میں جگہ نصیب کرے۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

ایک مربی و محسن
مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

محمد عرفان سلطانپوری
رکن، بی بی سی، لندن

۱۹۷۱ء میں جب میں نے ندوہ میں داخلہ لیا تو رہائش کے لئے "سلیمانیہ" ہاسٹل بالائی منزل میں مجھے جگہ ملی، اس ہاسٹل کے نگراں مولانا خطیب احمد صاحب ندوی تھے، پھر ۱۹۷۴ء میں میں مولانا سید محمد عبدالسمیع صاحب ندوی کے زیر نگرانی آگیا، شروع میں ہم لوگ یہی سمجھتے تھے کہ مولانا مرحوم بہت ہی غصہ ور ہیں اور سخت سزائیں دیتے ہیں، لیکن جب ان کی نگرانی میں رہنے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ مولانا نہایت ہی نرم مزاج ہیں اور جرم کے اعتبار سے مناسب سزائیں دیتے ہیں، میں نے مولانا کی نگرانی میں پانچ برس کا عرصہ گذارا تو سمجھ میں آیا کہ مولانا نہایت دور اندیش، زیرک، اور مردم شناس انسان تھے، ان کی عقابی نگاہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیتی تھیں کہ کون سا طالب علم علمی ذوق رکھتا ہے، کون وقت گذاری کے لئے ندوہ میں آیا ہے، اور کون غیر علمی ذوق رکھتا ہے، چنانچہ ان کی دور اندیشی طالب علم کے لحاظ سے اپنا کام کرتی تھی، مثلاً ایک طالب علم علمی ذوق رکھتا ہے تو وقتاً فوقتاً اس کو اپنے پاس بلاکر اس کے ذوق کے مطابق سوالات کرتے، اور اس کی علمی صلاحیت میں اضافہ کے لئے مفید اور کارآمد کتب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے، اور سلیمانیہ ہاسٹل میں ہفتہ وار جلسوں میں شرکت کی ترغیب دیتے، نیز ہر طرح سے اس کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے، اور اگر ان کی

نظر میں کوئی ایسا طالب علم ہوتا جس میں علمی ذوق نہ ہوتا یا کم ہوتا تو اس کی اس طرح سے ہمت افزائی کرتے اور کارآمد مشوروں سے نوازتے کہ اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو علمی ذوق اس میں پیدا ہو ہی جاتا، البتہ جو ایسے طلباء ہاسٹل میں آجاتے جو صرف نام کے طالب علم ہوتے، پڑھائی لکھائی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوتا تو ان پر مولانا کی خفیہ نگرانی ہوا کرتی تھی تاکہ ماحول کو شرپسند عناصر سے پاک رکھا جاسکے، اور ان کی اس خفیہ اور کڑی نگرانی کے خاطر خواہ نتائج سامنے آتے رہے۔

۱۹۷۵ء میں جب میں سلیمانیہ ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۹ میں تھا اتفاق سے اس کمرے میں میرے ساتھ کچھ ایسے طلباء بھی میرے ساتھ ہوگئے جن کی شرپسندی کے منفی اثرات مولانا نے بہت جلد ہی محسوس کرلئے اور مولانا مرحوم نے مجھ سے کمرہ بدلنے کے لئے کہا، لیکن میں چونکہ ان سب میں اچھی طرح گھل مل گیا تھا اس لئے میں نے مولانا سے گذارش کی کہ وہ میرا کمرہ نہ تبدیل کریں، لیکن مولانا نہ مانے ان کا اصرار برقرار رہا، جب میں نے کئی مرتبہ اسی کمرہ میں رہنے کی گذارش کی تو مولانا نے خاموشی اختیار کرلی، اور مجھے اسی کمرے میں رہنے دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ درجہ دوم عربی میں میرا نتیجہ خراب ہوگیا، تب مجھے شدّت سے اس بات کا احساس ہوا کہ مولانا میرے فائدے ہی کے لئے کمرہ بدلنے کا مشورہ دے رہے تھے، اور یہ میری ناعاقبت اندیشی تھی کہ میں نے ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔

ندوہ میں پچاسی سالہ تعلیمی جشن کے بعد (اس موقع پر سلیمانیہ ہاسٹل مہمانوں کے لئے خالی کرالیا گیا تھا) میں نے اپنے آپ کو مولانا مرحوم کے رحم وکرم نیز مشورے پر چھوڑدیا تھا اور یہ طے کرلیا کہ اب اگر مولانا کمرہ بدلنے کے لئے کہیں گے تو پہلی فرصت میں میں کمرہ بدل دوں گا، اور ایسا ہی ہوا، مولانا مرحوم نے مجھے کمرہ نمبر ۷ میں کردیا، یہاں پڑھنے والے طلباء موجود تھے جن کا

کچھ نہ کچھ عکس میرے اوپر بھی پڑا اور میں درجہ دوم عربی میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوا، جن مضامین میں میں پچھلے سال ناکام ہوا تھا ان ہی مضامین میں اس سال امتیازی نمبر ملے۔

۱۹۸۰ء میں میں ندوہ سے چلا آیا، مولانا مرحوم میرے ندوہ چھوڑنے کے بعد بھی اسی خلوص سے ملتے رہے جیسے میری ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے دور میں ملتے تھے اور بسا اوقات خط وکتابت کے ذریعہ میری خیریت بھی معلوم کیا کرتے تھے، مولانا کا انتقال ۵ شعبان ۱۴۱۶ھ کو ہوچکا تھا مجھے اس کی خبر نہیں تھی، عید کے موقع پر جب میں نے ایک پوسٹ کارڈ پر "عید مبارک" جلی حروف میں خوشخط لکھ کر شعبہ تعمیر وترقی کے پتے پر مولانا مرحوم کو روانہ کیا تو جواب میں "محکمات" کا وہ شمارہ آیا جس میں مولانا مرحوم کے انتقال کی جگر خراش خبر تھی۔

مصر کے مشہور قاری عبدالباسط مرحوم کے انتقال کی خبر مجھے مختلف اخبارات سے ہوئی تو میں نے "قومی آواز" میں ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے میں نے گذارش کی تھی کہ قاری صاحب مرحوم کے متعلق مصر سے معلومات فراہم کرکے "قومی آواز" اور "تعمیر حیات" وغیرہ میں ان پر مضامین شائع کرائیں، لیکن جب ایک مدّت گذرجانے کے بعد بھی اس مراسلہ کا کوئی اثر نہ ہوا تو میں نے اس سلسلہ میں "شیخ الازھر" جناب جاد عبدالحق علی جاد الحق کو عربی میں ایک خط تحریر کیا، مجھے ریڈیو قاہرہ کے شعبہ اردو کے ایک خط سے معلوم ہوچکا تھا کہ مصر کی "وزارت اوقاف" قاریوں کو ملک سے باہر بھیجا کرتی ہے، شیخ الازھر نے میرا خط وزارۃ اوقاف کو بھیج دیا تو وزیر اوقاف ڈاکٹر محمد علی محجوب کے ایماء پر شیخ رزق خلیل حبہ کی تحریر میں قاری عبدالباسط مرحوم کے سلسلہ میں معلومات اور ان کی زندگی پر کار آمد باتیں تفصیل کے ساتھ مصری سفارتخانہ نے دہلی سے مجھے روانہ کردیں،

میں نے ان معلومات کی روشنی میں ایک مضمون تیار کر کے "تعمیر حیات" میں اشاعت کے لئے بھیج دیا، مولانا مرحوم کو جب معلوم ہوا کہ یہ مضمون بھیجنے والا کوئی اور عرفان نہیں بلکہ راقم الحروف ہی ہے تو انھوں نے مجھے لکھا کہ میں نے دفتر "تعمیر حیات" کو ہدایت کردی ہے کہ تمہارا مضمون شائع ہوتے ہی اس کی ایک کاپی رجسٹری ڈاک سے تم کو روانہ کردی جائے۔ چنانچہ ۱۵ جون ۱۹۹۱ء کے تعمیر حیات میں وہ مضمون شائع ہوا اور ریڈیو قاہرہ کی اطلاع کے مطابق یہی مضمون ریڈیو قاہرہ کی اردو سروس سے نشر بھی کیا گیا۔

۱۹۹۴ء میں میں نے اپنے والد مرحوم کے انتقال کی خبر مولانا مرحوم کو دی تو مولانا نے مجھ سے افسوس کا اظہار فرمایا اور مجھے لکھا کہ ان کی قرآن خوانی جلد ہی کرادی جائے گی۔ والد صاحب مرحوم رائے بریلی میں مختلف صوبائی اعلیٰ عہدوں پر رہ چکے تھے، ان سے حضرت مولانا (علی میاں) اور مولانا مرتضیٰ صاحب مرحوم بھی واقف تھے، اب مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں تو ہماری یہی کوشش ہوتی ہے کہ مولانا مرحوم کے لئے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کیا جائے۔

مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر جب مجھے "محکمات" سے ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا، کیونکہ میں نے مولانا مرحوم سے جب بھی ملاقات کی ان کو تندرست وتوانا پایا، ان کی صحت سے ایسا ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ جلد ہی اور اچانک ایسا اندوہناک واقعہ پیش آجائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ نظام اور مرضی ہے کہ دنیا میں آنیوالے ہر شخص کو ایک دن اس دنیا سے جانا ہے، کوئی طویل عمر پاکر جاتا ہے تو کوئی اچھی خاصی صحت کے ساتھ ہی رخصت ہوجاتا ہے۔

اخیر میں میری خدائے تعالیٰ سے یہی دعاء ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

ندوہ کی مسجد میں پہلی تعزیتی تقریر

محمد خالد ندوی غازیپوری
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حضرات ! ابھی چند روز پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ وناظر کتب خانہ حضرت مولانا مرتضیٰ صاحب مظاہری کا سانحہ ارتحال پیش آیا ہم سب ان کی تدفین میں حاضر تھے، ایک طرف مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی مرحوم نڈھال سے بیٹھے ہوئے تھے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے ایک دیرینہ رفیق اور مخلص دوست کے بچھڑ جانے پر جتنا غم انہیں تھا ان کے چہرے کے ارتسامات سے اس کا بخوبی اندازہ ہورہا تھا، مرحوم نے مجھے دیکھ کر فرمایا " آج مولانا رخصت ہوگئے کل تم لوگ اسی طرح سے مجھے بھی یہاں لے آؤگے " ۔ آواز سے ضعف ونقاہت کا اظہار ہورہا تھا، سہارا دیکر اٹھایا اور باہر سڑک تک لایا، پھر ندوہ تک ایک ہی رکشہ پر ساتھ آنا ہوا، راستہ میں بار بار مولانا مرتضی صاحب مرحوم کا بڑے درد کے ساتھ تذکرہ کرتے رہے، آج موصوف کا یہ جملہ " تم لوگ مجھے بھی یہاں لے آؤگے " ایک حقیقت بن چکا ہے، ہم لوگ ابھی ابھی ان کی تدفین سے فارغ ہوکر آئے ہیں اور اب اس وقت مسجد میں تعزیت کے لئے جمع ہیں۔

حضرات ! دنیا میں جو آیا ہے جانے کے لئے آیا ہے لیکن ایک مسلمان کو تسلی ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ تعالی عنہا سے فرمایا تھا، جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خدمت عالیہ میں حاضر ہوئیں

تو اللہ کے رسول ؐ نے ان کو اپنے سے قریب کیا اور کان میں کچھ کہا، حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں حضرت عائشہ صدیقہ اس منظر کو دیکھ رہی تھیں پھر اللہ کے رسول ؐ نے حضرت فاطمہ زہراء کو دوبارہ قریب کیا اور کان میں کچھ کہا اس بار حضرت فاطمہ زہراء مسکرا اٹھیں بعد میں حضرت صدیقہ ؓ نے جب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ پہلی دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اب میں جدا ہونے والا ہوں یہ سن کر جی بھر آیا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں اللہ کے رسول ؐ نے جب یہ دیکھا تو پھر مجھے قریب کیا اور فرمایا کہ فاطمہ گھبراؤ نہیں سب سے پہلے تم مجھ سے ملنے والی ہو اور جلد ہی ملنے والی ہو اس پر میں مسکرائی تھی اور خوش ہوئی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر جانے والا جو جارہا ہے اپنے اگلوں سے اس کی ملاقات ہو رہی ہے اور جو پیچھے ہے وہ لائن میں ہے اور سب ہی ہیں اور انشاء اللہ وہاں پہونچ کر آپ ؐ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوگا اللہ تبارک تعالیٰ سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائیں (آمین)

حضرات مولانا کے تعلق سے ہمارے اساتذہ جو یہاں موجود ہیں اور جو اس موقع پر " اذکروا محاسن موتاکم" کی روشنی میں (کہ اپنے گزرے ہوئے لوگوں کے محاسن کا تذکرہ کرو) وہ آپ سے خطاب فرمائیں گے لیکن ہم نے بھی بہت کچھ دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ہم نے وہ دور دیکھا ہے کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ان کے فرزند مولانا عبدالجلیل صاحب ندوی جو کہ ہم لوگوں کے ساتھی تھے ان کے ساتھ بارہا گھر تک جانا ہوتا تھا مولانا سے ملاقات ہوتی تھی جس محبت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے آج بھی وہ یادیں مچلتی ہیں اور بار بار وہ باتیں یاد آتی ہیں۔ بہت قریب سے دیکھا ہے مولانا کو، جب وہ نگراں تھے اور نگراں سے پہلے بھی طلباء ان سے ڈرتے بھی تھے اور محبت بھی کرتے تھے، اور یہ سب ان کے اخلاق کریمانہ

کا اثر تھا، طلباء کی ضرورتوں میں خاموشی سے ہاتھ بٹاتے تھے، علمی رہنمائی فرماتے تھے، مضامین لکھواکر حوصلہ افزائی فرماتے تھے، طلباء کے لئے وظائف کی ایک لمبی فہرست تھی جسے انھوں نے مخفی رکھا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ شعبہ تعمیر و ترقی کے ذمہ داروں میں تھے جس کی وجہ سے ان کی مشغولیت دوچند ہوتی تھی لیکن ان تمام تر مصروفیات کے باوجود علمی ذوق رکھتے تھے اور ان کو لکھنے پڑھنے سے شغف تھا۔ رسالہ "محکمات" جو ہر مہینے پابندی سے ان کی ادارت میں نکلتا تھا آخر تک وہی اس کے مدیر بھی رہے اور اس کے پروف پڑھنے والے بھی اور اس کی طباعت کے تعلق سے مضامین کی فراہمی کرنے والے بھی، اور بسا اوقات ہم لوگوں کو بھی اس طرف متوجہ کرتے اور کبھی کوئی مضمون لکھا تو اس پر حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے ان کی کتاب " قصبہ کوڑا تاریخ و شخصیات " جب آئی تو ایک نسخہ مجھے بھی عنایت فرمایا اور کہا کہ اس کو تم دیکھو اور غور سے پڑھو اور اپنی رائے بھی دو، یہ کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی بصیرت کے ساتھ مورخانہ ذوق بھی عطا فرمایا تھا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ ان کا معاملہ بڑی محبت و پیار کا تھا۔ آج وہ ہم میں موجود نہیں، ہم سے رخصت ہوچکے ہیں، اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے بھردے اور بال بال مغفرت فرمائے۔

مولانا کا اصل وطن لکھنؤ نہیں بلکہ قصبہ " کوڑا " تھا، کوڑا جہان آباد ایک مردم خیز قصبہ ہے جو ضلع فتحپور میں واقع ہے اس کی ایک عظیم علمی وثقافتی تاریخ ہے، وہاں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں۔

مولانا کا تعلق سادات کے حسینی خاندان سے ہے جو مدینہ منورہ کے ایک قصبہ عریض سے ۶۲۱ھ میں روم منتقل ہوا پھر وہاں سے ہندوستان آیا، اسی لئے اس خاندان کے بعض لوگ اپنے کو عریضی بھی لکھتے ہیں، تقریبا پانچ سو سال سے آپ کا خاندان کوڑا میں رہائش پذیر تھا، آپ کے والد ماجد

مرحوم ۔ عوتی و تبلیغی امور بہتر طور پر انجام دینے کے لئے "کوڑا" سے کانپور منتقل ہوئے، اور مولانا عبدالسمیع صاحب کانپور سے ندوہ آگئے اور ندوہ ہی کے ہو کر رہ گئے، اور یہیں سے آخر اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور جنت الفردوس میں داخل کرے۔ (آمین)

ندوہ کی مسجد میں دوسری تعزیتی تقریر

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد
وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتاباً موٴ جلا ۔ صدق اللہ العظیم

یہ کوئی تقریر کا موقع نہیں ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ تذکیر کا موقع ہے، آپ لوگوں نے اکثر سنا ہوگا قصص الاولین پچھلے لوگوں کے واقعات بصیرت کا کام کرتے ہیں۔ اور ان تعزیتی جلسوں کی اصل غرض بھی یہی ہے کہ دنیا سے گزرنے والوں کے محاسن وخوبیاں سامنے آئیں، اس بنیاد پر ان کو اچھی صفات کے ساتھ متصف کیا جاتا تھا اور ان کی یاد کو آدمی اپنے لئے فخر وسعادت سمجھتا تھا، تو اس جلسہ کی اصل قدر وقیمت تو یہی ہونا چاہئے تھی خاص کر ان طلبہ کو جبکہ جلسہ تعزیت میں گزرنے والے کی خوبیاں بیان کی جائیں اسکا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ان خوبیوں سے اپنے آپ کو متصف کریں اور ان کو اپنائیں ۔ اور خوبیوں کے بارے میں آتا ہے کہ تم زمین پر اللہ کے گواہ بنا کر بھیجے گئے ہو، مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے، امت محمدیہ کو خطاب کرکے فرمایا، اسی آیت کا تتمہ یہ ہے کہ جب آخرت میں لوگوں سے حساب کتاب ہورہا ہوگا، اس وقت جب کسی شخص کے بارے میں لوگ اچھا گمان ظاہر کریں گے تو اللہ تعالیٰ اچھے گمان کی بنیاد پر بخش دے گا اور مغفرت فرمادے گا۔

اذکروا محاسن موتاکم یہ حدیث جو ابھی عزیز محترم مولانا خالد صاحب نے سنائی اسکا بھی درحقیقت مطلب یہی ہے کہ جب ہم ان کی خوبیوں کو یاد کریں گے ان کے محاسن کا تذکرہ کریں گے تو اللہ کیطرف سے جو فرشتے مقرر ہیں ہماری ہر بات کے لکھنے پر "ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید" وہ اس کو بھی نوٹ کرلیتے ہیں، اسکو بھی اپنی یادداشت میں لکھ لیتے ہیں اور قیامت میں ان شاء اللہ جسکا ہم ذکر خیر کریں گے وہ اس کے حق میں شہادت کا کام دے گی، تو ان تعزیتی جلسوں کا مقصد یہی ہوتا ہے۔

میں نے جو آیت تلاوت کی یہ وہی آیت ہے جو ہمارے عزیز محترم قاری صاحب نے تلاوت کی تھی کہ اللہ کیطرف سے ہر ایک کا وقت مقرر ہے، اور اس وقت سے پہلے دنیا سے کوئی رخصت نہیں ہوتا ہے۔

اب ختم ہونے والے کے پسماندگان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ ان کی ذات سے اگر وہ مال وزر ترکہ میں چھوڑ گئے ہیں تو اسی پر اکتفا کرکے بیٹھ جائیں یا یہ کہ ان کی وفات کو آخرت میں اجر کا ذریعہ بنائیں، اسلئے کہ قرآن میں اس آیت کا دوسرا جز جو ہے وہ یہی ہے " ومن یرد ثواب الدنیا نوتہ منھا ومن یرد ثواب الاخرۃ نوتہ منھا وسنجزی الشاکرین " تو اس میں دونوں فائدے ہیں، ایک تو مادی نفع جو ان کے افراد کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک معنوی نفع جس سے آخرت میں فائدہ اٹھائیں، اس کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا " سنجزی الشاکرین " جو آخرت کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ زیادہ قابل قدر ہے، اور زیادہ لائق اعتبار ہے، اور اللہ اس سے زیادہ دے گا جتنا وہ مانگے گا، ہم سب کو وفات پانے والے کے اس معنوی پہلو کو سامنے رکھنا چاہئے، جس سے ہماری آخرت بنے، جس کا فائدہ آخرت میں زیادہ ہو، اور اس کے بارے میں فرمایا " الصبر عند الصدمۃ الاولی " صبر کا صحیح وقت وہ ہوتا ہے جب کہ غم تازہ ہوتا ہے، اسوقت آدمی صبر کرے،

اگر خدا نخواستہ صبر نہیں کیا تو صبر کے ثواب سے محروم رہا، ایک تو وہ جو صبر کا اجر ملتا اس کو کھو دیا دوسرے جو حادثہ پیش آیا اس کا صدمہ برداشت کیا، اس طرح گویا دو نقصان ہوئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر کی توفیق نصیب فرمائے، اور مرحوم کی خوبیوں کو اپنانے کی توفیق نصیب کرے۔

مجھے الحمد للہ پچیس سال کے قریب مرحوم کے پڑوسی ہونے کا شرف حاصل رہا اور میں ان کی جس خوبی سے سب سے زیادہ متاثر ہوا --- یوں تو ان کے اندر ہزاروں خوبیوں تھیں اور ہیں جن کا ابھی تذکرہ آیا یا آئندہ آئے گا --- ان کی سب سے زیادہ اہم خوبی تھی غض بصر، قلت کلام، ہمیشہ نگاہ نیچی کر کے چلتے، اور گفتگو بھی بقدر ضرورت کرتے، اور ان کو کبھی فضول یاوہ گوئی کرتے یا خوامخواہ کی باتیں کرتے یا گپیں ہانکتے ہوئے اور اسی طرح بے محابا قہقہے لگاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، یہ بڑی خوبی ہے کہ آدمی لایعنی سے بچے حدیث میں آتا ہے کہ " ایسی باتوں سے جن کا کوئی نفع دنیا و آخرت میں نہ ہو اس سے آدمی بچے اس کے مسلمان ہونے کی علامت یہی ہے، تو یہ ایک بڑی اہم خوبی ہے، اور اس سے بڑی دوسری خوبی جو معنوی اعتبار سے اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ ہے جماعت کی پابندی کہ برسات ہو جاڑا ہو گرمی ہو کیسا ہی موسم ہو۔

بڑھاپا تو مولانا کا بہت دنوں سے شروع ہو چکا تھا پیروں میں تکلیف تھی اور گھٹنوں میں تکلیف تھی اور تکلیف کی وجہ سے رکوع کرنے میں اور سجدہ کرنے میں دشواری ہوتی تھی جس کے لئے مولانا تکیہ لاتے تھے لیکن جماعت کا ترک بقدر ضرورت بھی نہ کرتے تھے۔ بعض شرعی مواقع رخصت کے ایسے بھی سامنے آئے لیکن میرے خیال سے مولانا نے ان رخصتوں سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ ہمیشہ جماعت کا التزام کرنا یہ عند اللہ مقبولیت کی بڑی اہم دلیل ہے۔ انشاء اللہ یہ سب چیزیں ان کے کام آئیں گی۔ تیسری بات جو قابل

ذکر ہے اور طلباء عزیز اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ اللہ نے انکو خود بھی علم دین سے نوازا تھا اور میں نے سنا تھا کہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں بھی تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے بعد یہاں آ کے تکمیل کی اور انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اسی لائین پر لگایا۔ بحمد اللہ ان کے تین صاحبزادے ندوی ہیں باقاعدہ فاضل بھی ہیں یہاں کے، ان میں سے دو حافظ بھی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ آخرت میں قرآن مجید کے حفظ کرنے والے ہی کو نہیں بلکہ ان کے والدین کو بھی قیامت کے دن تاج پہنایا جائے گا جو اس کے اعزاز کی علامت ہوگی تو یہ بڑی قابل قدر بات ہے اور عام طور سے اب یہ بات کم ہوتی چلی جارہی ہے کہ علماء بھی اپنی اولاد کو اسی دینی تعلیمات پر ڈالیں ایسا بہت کم ہورہا ہے لیکن مولانا نے الحمد للہ دینی جذبہ کے تحت اور ان کا اس سے کوئی دنیوی مقصد نہیں تھا اگرچہ اللہ نے ان کے اس دینی جذبہ کی لاج رکھی کہ وہ اولاد ان کی جس نے محض دینی جذبہ کے تحت تعلیم حاصل کی اور یہاں سے فارغ ہوئے تھے اللہ نے دنیوی اعتبار سے بھی بہت نوازا، دو صاحبزادے ان کے باہر عرب ملکوں میں ہیں ایک دبئی میں ہیں اور ایک ریاض میں ہیں، لیکن مقصد غالباً مولانا کا یہ نہیں تھا ان کو پڑھانے کا، لیکن اللہ کا ایک فضل ہوتا ہے کہ جو شخص دین کے لئے دینی تعلیم حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا بھی عطا فرماتا ہے دنیا اس کے قدموں پر ڈال دیتا ہے، اور جو دنیا کے لئے دین پڑھتا ہے تو نہ دین ہی اس کے ہاتھ آتا ہے اور نہ دنیا اس کے ہاتھ آتی ہے، یہ بہت قابل غور بات ہے کہ دین کو دین کے لئے پڑھا جائے تو پھر اللہ ایسا فضل فرماتا ہے کہ دنیا اس کے قدموں پر ڈال دیتا ہے، دنیا اس کے آگے ناک رگڑتی ہے اور اگر خدانخواستہ دین کو دنیا حاصل کرنے کے لئے پڑھتا ہے تو دنیا اس سے دور بھاگتی ہے، اور یہ دنیا کے پیچھے بھاگتا ہے اور دین بھی اسکا اکثر جاتا رہتا ہے، تو مولانا کی بہت سی خوبیاں ہیں جنکے بیان کرنے کا نہ یہ

موقع ہے اور نہ وقت ہے، تو یہ تین چار باتیں میرے نزدیک بہت اہم تھیں اور ان کی بنیاد پر اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ان کے مراتب بلند ہوتے ہوگے، اور اللہ تعالی ان کو بڑا مرتبہ عطا فرما رہا ہوگا، آخرت میں وہ بہت خوش ہوگے اور اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوگے اور کیا بعید ہے کہ وہ اپنی زبان حال سے کہہ رہے ہوں :

" یالیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین "

مولانا عبدالسمیع ندویؒ

خط طلحہ بن ابو سلمہ ندوی بنام محمد عبدالرشید ندوی

۲۹ فروری ۱۹۹۶ء

صدیقی الحمیم ! سلام مسنون

خدا کرے مزاج بخیر ہو۔

تعمیر حیات اور محکمات کے ذریعہ یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ جناب کے والد ماجد اور ہمارے استاذ، ندوہ کے فرزند مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی کا انتقال ہوگیا " انا للہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما اعطی ولہ ما اخذ وکل شیء لاجل مسمی"

محترم کیا اور کیسے لکھوں کہ اس حادثہ فاجعہ کا دل پر کیا اثر ہوا، غمگین میں ہی نہیں بلکہ پورا ادارہ ترجمہ وتالیف سوگوار ہوگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی ذات ایک انجمن تھی، وہ ندوہ کے فرزند عزیز تھے، ہمیشہ اس کے لئے فکرمند رہتے تھے اور اپنی ذات سے انھوں نے اس ادارہ کو فائدہ پہونچانے کی ہمیشہ کوشش کی، ان کی تحریر وتقریر اور علمی ومذہبی کاوشوں سے ندوی طرز فکر نمایاں تھا، ان کی بہترین اور اعلی صلاحیتیں دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی عظیم اور تاریخی درسگاہ کے لئے وقف تھیں، اللہ کے اس مخلص بندہ نے قرآن وحدیث کی خدمت بڑے اخلاص سے کی اور ایک پوری نسل انھوں نے تیار کردی۔ دوسری طرف علمی میدان میں ان کا تعلق عوام سے براہ راست بھی تھا " محکمات " کی ادارت بھی فرماتے تھے اور عوام کی رہنمائی اور ان کے مسائل کے حل کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے، معاشرہ کے مختلف طبقات سے ان کے تعلقات وسیع اور متنوع تھے،

اتنے کمالات کا انسان اتنی سادہ زندگی گزارتا تھا اور اتنا متواضع تھا یہ مولانا کی خصوصیات میں سے ہے، اللہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

آپ کو مولانا کے انتقال پر جو صدمہ ہونا چاہئے تھا وہ فطری بات ہے، دوسری طرف ان کے اٹھ جانے سے تمام ذمہ داری آپ پر آگئی ہوگی۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ان تمام علمی ودینی ذمہ داریوں کو نبھانے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائے جو مولانا کے انتقال سے آپ پر آگئی ہیں، امید ھیکہ ان کے قائم کردہ ادارہ --- جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام --- کے ذریعہ مولانا کے ادھورے علمی ودینی کاموں کو آپ مکمل کرینگے، اور ان تمام علمی کاموں کو منظر عام پر لائیں گے جو آپ کے والد محترم کرنا چاہتے تھے، اللہ تعالی آپ کو ہمت وقوت اور صبر وتحمّل عطا فرمائے، اور ترقی وکامیابی سے نوازے۔

مولانا مرحوم سے ہمارے ۲۵ سال مراسم تھے اور ادارہ ترجمہ وتالیف کی مغتنم شخصیت تھے، محکمات پابندی سے ہر ماہ بھیجا کرتے تھے اور ادارہ مرکزیہ کی کتابیں بھی، ادارہ ترجمہ وتالیف کلکتہ نے فوراً قرآن خوانی اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا اور ان کے لئے دعائیں کی گئیں، اللہ تعالی قبول فرمائے (آمین) ان کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں جگہ نصیب کرے، آپ کو اور آپ کے اہل خاندان کو، خصوصاً والدہ محترمہ کو صبر وشکر کی توفیق دے (آمین) میری تعزیت اور سلام جملہ لواحقین تک پہونچادیں۔

والسلام

شریک غم

طلحہ بن ابو سلمہ ندوی، کلکتہ

شجرہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

محمد عبدالرحمٰن حسینی

شجرہ لکھنے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ابتدا خاندان کے پہلے شخص سے کی جائے، دوسرے یہ کہ خاندان کے آخری شخص سے کی جائے، میں نے پہلا طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ موجودہ نسل یا بعد میں آنیوالی نسل اسی کے آگے اضافہ کرتی چلی جائے، علحدہ سے شجرہ دوبارہ نہ لکھنا پڑے۔

حضرت سیدہ فاطمہ زہراء بنت سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ وسیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ

۲۔ حضرت سیدنا امام حسینؓ

۳۔ حضرت سیدنا زین العابدین (علی الاصغر) ان کے تین بھائی، سیدنا علی الاکبر، سیدنا جعفر، سیدنا عبداللہ اور دو بہنیں سیدہ سکینہ اور سیدہ فاطمہ تھیں۔

۴۔ سیدنا امام محمد باقر (ان کے پانچ بھائی تھے، عبداللہ الباہر، زید شہید، عمر الاشرف، حسین الاصغر، علی الاکبر)

۵۔ سیدنا امام جعفر صادق

۶۔ (ابوالحسن) علی عریضی (ان کے تین بھائی تھے احمد شعرانی، حسن عریضی، جعفر عریضی)

۷۔ محمد عریضی

۸۔ عیسی نقیب رومی (ان کے چار بھائی تھے، یحیٰ، حسین، حسن، جعفر)

۹۔ حسن محدث (ان کے ۲۹ بھائی تھے)

۱۰۔ عیسیٰ ثانی

۱۱۔ محمد تقی

۱۲۔ محمد کاظم

۱۳۔ حمزہ

۱۴۔ جعفر

۱۵۔ عبدالکریم

۱۶۔ رضی الدین

۱۷۔ عمادالدین

۱۸۔ شہاب الدین

۱۹۔ شمس الدین

۲۰۔ نجم الدین

۲۱۔ سالار عماد (الدین)

۲۲۔ شیخ خواجگی (عرف خوجن میاں)

۲۳۔ سالار شہاب الدین ثانی عرف سالار ھبۃ اللہ اول

۲۴۔ سالار راجہ (راجن) فتحپوری

۲۵۔ سالار ھبۃ اللہ ثانی (یا ھبۃ الدین)

۲۶۔ مخدوم قطب الدین سالار بڈھ (۸۶۸ - ۹۳۶ھ)

۲۷۔ شاہ علاء الدین عرف شاہ حسین (ان کے دو بھائی تھے، شاہ بہاء الدین، شاہ جمال الدین)

۲۸۔ شاہ قطب الدین

۲۹۔ شاہ حسین ثانی

۳۰۔ شاہ جلال

۳۱۔ محمد فیروز عرف پوجا میاں

۳۲ - مخدوم جہانیاں

۳۳ - صبغۃ اللہ

۳۴ - محب اللہ

۳۵ - کرم علی

۳۶ - جمال علی

۳۷ - لیاقت حسین

۳۸ - محمد عبدالحی

۳۹ - محمد عبدالسمیع ندوی

والد صاحب کے دو بھائی محمد عبدالحفیظ (پاکستان) محمد عبدالمجید مرحوم اور چار بہنیں، اظہار فاطمہ (پاکستان) جمیلہ خاتون، خدیجہ خاتون، متینہ خاتون ہیں۔

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱ - ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز

۲ - سید محمد عبدالرشید ندوی

۳ - سید محمد عبدالجلیل حسینی ندوی

۴ - عامرہ خاتون

۵ - شاہدہ خاتون

۶ - سید عبدالرحمان

۷ - سید محمد عبیدالرحمان

۸ - عبدالحی ثانی

۹ - رقیہ خاتون

۱۰ - عارفہ خاتون

۱۔ ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز ایم۔اے، مقیم کانپور

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ تسنیم فاطمہ عرف صبا

۲۔ محمد عبدالعظیم

۳۔ محمد عبدالرحیم عرف احمر

۴۔ آمنہ خاتون

۵۔ سعدیہ خاتون

۶۔ محمد عبدالسمیع ثانی عرف انس

۲۔ سید محمد عبدالرشید ندوی ایم۔ اے، مقیم ریاض

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ عذراء خاتون

۲۔ محمد عبدالحمید

۳۔ محمد عبدالوحید

۴۔ محمد عبداللہ

۵۔ محمد عبدالعلیم (عرف فہد)

۶۔ اسماء خاتون

۷۔ زہراء

۸۔ طلحہ

۹۔ صالحہ

۱۰۔ محمد احمد

۱۱۔ عالیہ

۱۲۔ فاطمہ

۱۳۔ محمد عبدالعلی

۱۴۔ فائزہ

۳۔ حافظ قاری سید محمد عبد الجلیل حسینی ندوی، مقیم دبئی

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ عبد السلام عرف عادل

۲۔ ذکیہ خاتون

۳۔ عطیہ خاتون

۴۔ عبد الحنان

۴۔ عامرہ خاتون زوجہ ڈاکٹر سید اشفاق حسین، رائے بریلی

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ مریم فاطمہ

۲۔ محمد افضال کاشف

۳۔ محمد آصف

۵۔ شاہدہ خاتون زوجہ سید نیاز احمد، فتحپور ہسوہ

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

ابھی تک لاولد ہیں۔

۶۔ سید محمد عبد الرحمان بی۔اے، مقیم ندوہ لکھنو

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ عبد المنان عرف طہ

۲۔ عباد الرحمان عرف یحیی

۷۔ حافظ سید محمد عبید الرحمان بی - اے مقیم ندوہ، لکھنو

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے :

۱۔ ام ایمن

۸۔ رقیہ خاتون زوجہ سید ملک اشرف، بلرامپور، گونڈہ

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے :

۱۔ خدیجہ خاتون

۲۔ محمد عمر

۳۔ حسن عثمان

۹۔ عارفہ خاتون زوجہ سید عقیل الرحمان، فتحپور ہسوہ

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے :

۱۔ زینب بتول

۲۔ طیبہ

۳۔

۱۰۔ سید محمد عبد الحی ثانی، مقیم ندوہ لکھنو

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے :

۱۔ فروغ احمد عابد

۲۔

شجرہ اہلیہ محترمہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

رابعہ خاتون بنت محمد منیر، ساکن قصبہ مجھاون ضلع کانپور

اس خاندان کے بعض علماء عہدہ قضاء پر فائز رہے ہیں اس لئے قاضی کے لقب سے مشہور ہیں، یہ خاندان برسوں کالپی پھر جلالپور ضلع کانپور میں بھی مقیم رہا ہے، اور بعض اہل خاندان اب بھی وہاں موجود ہیں۔

۱۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

۲۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ

۳۔ عبدالکریم

۴۔ عبدالمجید

۵۔ محمد

۶۔ حسن زنجانی

۷۔ عماد

۸۔ ابوبکر

۹۔ شیخ ابوالفتح

۱۰۔ قاضی سراج الدین فراحی

۱۱۔ سید الدین معروف بہ مولانا خواجگیؒ کالپوی (ان کے ایک بڑے بھائی محمد یوسف معروف شاہ ابوالاعلیؒ جاجموی بڑے مشہور ہیں)

۱۲۔ تاج الدین

۱۳۔ عبدالعزیز

۱۴۔ بندگی معروف

۱۵۔ محمد یاسین

۱۶۔ یعقوب

۱۷۔ مصطفی عرف موسیٰ حافظ

۱۸۔ قاضی سلطان

۱۹۔ عبدالقادر

۲۰۔ نثار اللہ

۲۱۔ شکر اللہ

۲۲۔ محمد فیروز

۲۳۔ فتح اللہ

۲۴۔ شیخ کالے

۲۵۔ محمد مراد

۲۶۔ پیر زماں

۲۷۔ دوست محمد

۲۸۔ محمد ضمیر (ان کے دو بھائی محمد امیر محمد وزیر اور ایک بہن الفت منکوحہ اول احمد حسین بھی ہیں)

۲۹۔ محمد منیر (ان کے دو بڑے بھائی محمد عادل اور محمد نظیر بھی ہیں)

۳۰۔ محمد سلیمان (ان کے دو چھوٹے بھائی محمد عبدالقدیر، محمد عبدالصمد اور ایک بہن رابعہ خاتون زوجہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ بھی ہیں)

نوٹ: سید الدین معروف بہ مولانا خواجگیؒ کالپوی سے پہلے کچھ پشتیں چھوٹ گئیں ہیں، مولانا خواجگی پر لکھی گئی تاریخی یا سوانحی کتابوں سے اسے مکمل کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ ان کے خاندان کے حالات پر ایک فارسی مخطوطہ بھی ہے اس میں بھی چھوٹی ہوئی پشتوں کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ محمد سلیمان فاروقی، مقیم اناؤ

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے

(۱) عائشہ خاتون زوجہ سید عزیزالحسن (اناؤ)

(۲) واسعہ خاتون زوجہ سید محمد نسیم مرحوم (کانپور)

(۳) صفیہ خاتون زوجہ سید محمد عبدالرشید ندوی (مقیم ریاض، سعودی عرب)

(۴) رضیہ خاتون زوجہ سید قائم رضا مرحوم (سٹی ضلع کانپور)

(۵) محمد عثمان منسوب بہ مدحت فاطمہ بنت محمد حبیب صدیقی (باندہ)

(٦) محمد عرفان منسوب بہ سویداء مہوش عرف شاداں بنت عبدالحفیظ صدیقی (سلطانپور، پیارے پور) نواسی مولانا عبدالقدوس رومی، مفتی آگرہ

(۷) محمد لقمان

(۸) محمد نعمان

۲۔ محمد عبدالقدیر فاروقی، مقیم منجھاون، ضلع کانپور

کی اولاد ذکور واناث بترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ محمد ظہیر

۲۔ واجدہ خاتون، زوجہ حافظ سید محمد عبدالجلیل حسینی (مقیم دبئی)

۳۔ محمد عبدالصمد فاروقی، مقیم منجھاون، ضلع کانپور

کی اولاد ذکور واناث حسب ذیل ہے:

۱۔ نسیم فاطمہ

۲۔ انیس فاطمہ

۳۔ محمد شمیم

تاریخی امانتیں

محمد عبدالرشید ندوی

تاریخی اور ادبی لحاظ سے خطوط کی بڑی اہمیت ہے، یہی وجہ ہے کہ غالب کے خطوط کا مجموعہ "غالب کے خطوط" اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" اردو ادب میں آج بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، بسا اوقات خطوط میں وہ باتیں مل جاتی ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں بھی نہیں ملتی ہیں، والد صاحب کا تعلق چونکہ اندرون ملک و بیرون ملک مختلف قسم کے لوگوں سے مختلف نوعیت کا تھا اس لئے اس تعلق کی وضاحت چند جملوں میں نہیں کی جاسکتی اس کا اندازہ ان کے بعض خود نوشت خطوط سے اور ان کے نام آئے ہوئے بعض خطوط ہی سے ہوسکتا ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں ان کے لکھے ہوئے اور ان کے نام آئے ہوئے چند خطوط کے بعض اقتباسات پیش کردیئے جائیں، چنانچہ اولاً میں نے والد رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے خطوط کے ضروری اقتباسات نقل کئے ہیں، اس کے بعد والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام دوسروں کے لکھے ہوئے خطوط کے ضروری اقتباسات نقل کئے ہیں، جس جگہ اس طرح کے ..... نقطے لگے ہیں وہ اس بات کا اشارہ ہے کہ یہاں کی عبارت چھوڑدی گئی ہے، خطوط کی حیثیت ایک تاریخی امانت کی ہوتی ہے اس لئے بھی ان کا تذکرہ ضروری تھا، بہت ممکن ہے کل کا مؤرخ ان خطوط سے بعض تاریخی حقائق کا سراغ لگا سکے، اور بعض قارئین ان خطوط کی معلومات سے فائدہ اٹھاسکیں۔

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ کے خطوط

درج ذیل خطوط میں سے چھ خط راقم الحروف کے نام ہیں، بعض بابری مسجد کے انہدام کے بعد کے حالات سے متعلق ہیں اور بعض اس وقت زیر ترتیب

کتاب " قصبہ کوڑا تاریخ و شخصیات " کے سلسلہ میں میرے بعض سوالات کے جواب میں ہیں۔

خط نمبر ۱ :

پوسٹ بکس ۹۳ ندوہ، لکھنؤ

۲۶ مارچ ۱۹۹۳ء

برخوردار من دعاء ! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

..... یہاں بحمد اللہ سب خیریت ہے، یہاں کے حالات اتنے سنگین اور غیر متیقن ہیں کہ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے ..... ملی کونسل کے سلسلہ میں وہاں کچھ پیشرفت ہوئی یا نہیں ؟ وہاں کے لوگ تو یہی سوچتے ہوں گے کہ دوسرے ملک کے اندرونی مسائل میں مداخلت کرنا مناسب نہیں .....۔

ایک بات اور سمجھنے کی ہے آج کا کا مسلم نوجوان دفاعی پوزیشن میں نہیں رہنا چاہتا، جارحانہ پوزیشن اختیار کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی رہنمائی کی ضرورت ہے کہ کہاں کن حالات میں دفاعی پوزیشن مناسب ہے اور کہاں جارحانہ پوزیشن اور کہاں کن حالات میں بھائی چارگی کی پوزیشن اختیار کرنا ضروری ہے، مسلمان نوجوان ان تینوں صورتوں میں امتیاز نہیں کرپاتا اور دھوکہ کھاجاتا ہے، نتیجۃً مار کھاتا ہے .....۔ والدعاء

محمد عبدالسمیع ندوی

خط نمبر ۲ :

پوسٹ بکس ۹۳ ندوہ، لکھنؤ

۲۸ مئی ۱۹۹۳ء

برخوردار من دعاء !

..... نئی دنیا میں شائع شدہ دو مضامین اور بھیج رہا ہوں، دونوں مضامین ایک ہی اشاعت کے ہیں " خواتین کی چار تنظیموں " کے مشترک وفد نے احمد آباد، سورت،

اور بھوپال کا دورہ کرکے رپورٹ دی تھی، اس مضمون کو بھی عربی اخبارات میں آنا چاہئے، یہ بھی بہت ضروری ہے عرب دنیا کو معلوم تو ہو ہندوستان میں مرد تو مرد مسلم خواتین کے ساتھ کیا ہورہا ہے، ۱۹۳۵ء میں جب پہلی بار انگریزوں نے اسرائیلی نوآبادی قائم کی تھی تو فلسطینیوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کی حد نہیں چھوڑی تھی، مفتی امین الحسینی نے اس سلسلہ میں عربی میں کچھ لٹریچر شائع کیا تھا ہم دس بارہ طلبہ کا ایک گروپ چار چار یا دو دو کی تعداد میں حضرت مولانا (علی میاں) کی سربراہی میں بنا تھا ہر جمعہ کو شہر کی مختلف مساجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ہم لوگ تقریریں کرکے فلسطینیوں کے ساتھ ہوئے مظالم سے لوگوں کو مطلع کرتے تھے، اسی سلسلہ کی بعض تصاویر بھی ہم لوگ نمازیوں کو دکھاتے تھے، اس طرح فرنگی حکومت کے خلاف ایک فضا بناتے تھے جس کا سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا، اس سلسلہ میں ایسی مساجد کا انتخاب جمعرات کے دن حضرت مولانا (علی میاں) کی موجودگی میں ہوجاتا تھا جہاں نمازی زیادہ آتے تھے۔ اب ہندوستانی مسلمانوں پر وقت پڑا ہے عربوں کو متوجہ ہونا چاہئے ......۔

روس کے جو صوبے مسلم اکثریت کے علیحدہ ہوئے ہیں یہ گربڑا رہے ہیں، ایک صاحب کے ذریعہ میں نے "بی بی سی لندن" سے شائع شدہ ایک رسالہ منگوانے کی کوشش کی ..... اس نے دو تین خطوط لکھے لیکن وہاں سے جواب نہیں ملا، یہ لڑکا ہردوئی سے منتقل ہوکر سلطان پور شہر آگیا ہے اس کو پھر خط لکھوں گا، مسلم اکثریت کی یہ جمہوریائیں بھی یہاں کے حالات سے ناواقف ہیں، ان کو اپروچ (APPROACH) کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا .....۔ والدعاء

محمد عبدالسمیع ندوی

خط نمبر ۳:

پوسٹ بکس ۹۳ ندوہ، لکھنؤ

جون ۱۹۹۳ء

برخوردار من سلمہ دعاء! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

..... جنوری فروری کے شمارہ (محکمات) میں "راجیو سنتھانم" کی رپورٹ ہے اس کو بھی عربی میں کرا کر شائع کرانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ پرائم منسٹر کی سازش محسوس کریں، ..... "آل انڈیا ملی کونسل" مسلم پرسنل لا بورڈ کا سیاسی فورم ہے، جس طرح "مجلس مشاورت" کا "مسلم مجلس" سیاسی فورم تھا، ملی کونسل سے مولانا کو تعلق ضرور ہے لیکن عہدیدار نہیں، مشورہ وغیرہ دیدیتے ہیں، منصب قبول کرنا ان کے لئے مناسب بھی نہیں تھا، ...... والدعاء

محمد عبدالسمیع ندوی

خط نمبر ۴:

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۰/۱۰/۱۹۹۳ء

برخوردار من دعاء! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک خط تم کو لکھ چکا ہوں، یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔ "گاہے گاہے باز خواں" والا مضمون اصلاح کرکے روانہ کررہا ہوں، حکیم سید نصرت حسین والا مضمون تم کو بھیج چکا ہوں "مالٹا" سے روانہ کئے ہوئے ایک خط کی فوٹو کاپی دونوں طرف کی بھیج رہا ہوں ......۔

تمہارے دادا ابا حضرت شیخ الہند کی کوڑہ آمد کے موقعہ پر میسوپوٹامیہ میں تھے شادی ہوچکی تھی، مولانا محمد ہاشم صاحب نے مولانا مدنی سے "اعانتِ کفار" کا مسئلہ چھیڑ کر ان کے کفر اور ابطال نکاح کا تذکرہ کیا، اس موضوع پر بھی بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی مولانا مدنی تکفیر کے خلاف تھے، آخر مولانا ہاشم صاحب نے حضرت شیخ الہند سے فیصلہ کی درخواست کی، حضرت شیخ الہند گاؤتکیہ سے ٹیک

لگائے بیٹھے تھے، وہ اٹھے اور یہ فرمایا کہ "کسی مسلمان کو کافر کہتے ہوئے میرا گلا گھٹتا ہے" ..... تمہارے دادا ابا کی میسو پوٹامیہ سے واپسی کے بعد ان کی ہر ملی تحریک میں مولانا محمد ہاشمؒ برابر شریک رہے "خلافت تحریک" میں شریک رہے، ساتھ ساتھ دورے کرتے تھے پھر "تبلیغ و تنظیم" کی تحریک میں بھی شریک رہے اپنے صوبہ کے جمعیۃ میں "معتمد تعلیمات" تھے۔

لیکن یہ تذکرہ رہ گیا غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں "الجمعیۃ" کے پہلے ایڈیٹر مولانا مودودی تھے اس زمانہ میں وہ کلین شیو تھے، انہوں نے تمہارے دادا ابا کے خلاف کفر کا فتویٰ لگایا تھا جس کو میں نے غالباً ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں "الجمعیۃ" ہی میں شائع شدہ ایک مضمون "جمعیۃ العلماء اپنی تجاویز کے آئینے میں" دیکھا تھا، حوالہ کے لئے یہ پرچہ اب مجھے مل نہ سکا اس لئے میں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا، مفتی کفایت اللہ صاحب کے مجموعہ فتاویٰ "کفایت المفتی" نامی میں میں نے مفتی کفایت اللہ صاحب کا ایک فتویٰ دیکھا تھا جس میں انہوں نے تمہارے دادا کے کفر کا انکار کیا تھا اور تبلیغی جدوجہد کی حمایت کی تھی، کفایت المفتی کا پہلا دوسرا حصہ تو میں نے دیکھ ڈالا وہ نظر نہ آیا، ممکن ہے کہ یہ بعد کے ایڈیشن ہوں اور شخصی چیز تھی اس کو ناشر نے نکالدیا ہو۔

یہ تکفیر بازی صرف اس لئے تھی کہ "تبلیغ و تنظیم" کی تحریک سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا، تمہارے دادا ہی زیادہ متحرک تھے، کانفرنسیں، مناظرے، جلسے وغیرہ کا سارا اہتمام وہی کرتے تھے "تبلیغ و تنظیم" کی تحریک تو "شدھی سنگھٹن" کے دفاع میں شروع کی گئی، جمعیۃ علماء کے چوٹی کے حضرات بہر حال اس میں شریک تھے مولانا حسین احمد (مدنی) مولانا شبیر احمد عثمانی تو خاص طور پر تھے ..... ۔ والدعاء

محمد عبدالسمیع ندوی

نوٹ: تقسیم سے قبل دادا مرحوم نے اسی تکفیر بازی اور علماء کی عدم توجہی کی بناء پر "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام انبالہ" کے صوبائی نظامت کے عہدے سے سبکدوشی کا فیصلہ کرلیا، لیکن اس سے پہلے اپنے اطمینان قلب کے لئے متعدد

اداروں، مدرسوں، جامعات کے علماء سے اس مسئلہ میں استفتاء لیا تو ہر ایک نے اسے وقت کی ضرورت کہا اور اس سے علیحدگی سے منع کیا تو تبلیغ اسلام کے کام میں مزید دلجمعی کے ساتھ لگ گئے، تفصیل کے لئے ماہنامہ "محکمات" لکھنؤ، ستمبر ۱۹۸۴ء ملاحظہ ہو۔

خط نمبر ۵:

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء

برخوردار من سلمہ دعاء!

۱- .....۔

۲- .....۔

۳- حضرت شیخ الہند کی تحریک میں ناکامی کے متعدد وجوہ تھے:

(الف) پہلی وجہ تو یہ تھی کہ برطانیہ کے اشارہ پر روس ایران میں داخل ہوگیا تھا افغانستان اور ترکی کے راستے بند ہوگئے تھے حضرت شیخ الہند کے استصواب پر غالب پاشا نے یہ بات ان کو بتائی تھی۔

(ب) برطانیہ ہی کے اشارہ پر شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تھی، ترکوں کی فوج پورے حجاز میں صرف چھ ہزار تھی ایک ہزار طائف میں تھی بقیہ دوسرے مقامات پر، پھر مرکز سے خاصے فاصلے پر تھی مرکز سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ دو مہینہ کے اندر اندر ترکوں کی حکومت ختم ہوگئی۔

(ج) ریشمی رومال کے پکڑ جانے کی وجہ سے پورا راز فاش ہوگیا تھا اور گرفتاریاں شروع ہوگئی تھیں حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء بھی گرفتار ہوگئے .....۔

ایک بات اور بتادوں مولانا سندھی جب افغانستان پہونچے ہیں تو حکومت کی نظر میں خود کو بے ضرر ثابت کرنے کے لئے نماز کھانے، سونے کے سوا زیادہ تر شطرنج کھیلا کرتے تھے، وہاں ہندوستانی مہاجرین کی خاصی تعداد تھی اور ہندوستانی تاجروں کی بھی، بہت کم افراد سے ملاقات کرتے تھے، سی آئی ڈی نے حکومت کو

رپورٹ دی کہ یہ آدمی بے ضرر ہے، ہر وقت شطرنج ہی کھیلا کرتا ہے۔

مولانا سندھی اس وقت امیر کابل سے ملے ہیں جب ترکی اور جرمنی کا کمیشن اعانت وامداد کے لئے افغانستان پہونچا ہے۔ یہ اس کمیشن کے ساتھ امیر کابل سے ملے اور برطانیہ کی مخالفت میں پرزور تقریر کی، اس طرح انکی رسائی امیر کابل تک ہوئی پھر متعدد ملاقاتیں ہوئیں تب "حکومت موقتہ" قائم کرنے کی اجازت حاصل کرسکے تھے۔ یہ بات بھی انہوں نے ہم لوگوں کو بتائی تھی۔

طلبہ جب ان سے اگلا پروگرام پوچھتے تھے تو مولانا بہت خفا ہوتے تھے، گفتگو کا رخ بدل دیتے تھے، ایک بار میں بھی پھنسا تھا، ہم تین آدمی تھے مولانا بہت نرم لہجے میں واقعات بتارہے تھے میں نے ان کے لہجے کی نرمی محسوس کرکے یہ توقع قائم کی کہ ممکن ہے مولانا اگلا پروگرام بتادیں، سوال کیا، لیٹے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے فرمانے لگے " میں نے تم کو اگلا پروگرام بتادیا اور اور تم اس میں ناکام ہوئے تو تم کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے زمین میں دفن کردوں گا کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ تم کہاں گئے" پھر نرم پڑگئے اور گفتگو کا رخ بدل دیا، عجیب لوگ تھے۔

والدعاء

محمد عبدالسمیع ندوی

خط نمبر ۶ :

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء

برخوردار من سلمہ دعاء ! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

..... یہ غلط ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی حکومت موقتہ قائم کرنے سے پہلے روس کا دورہ کرچکے تھے اور لینن اور اس کے رفقاء سے انقلاب کی ٹکنک سمجھی تھی۔ ریشمی رومال کی تحریک کے پکڑ جانے کے بعد حکومت ھند کے دباؤ سے افغان حکومت نے ان کو نکالدیا تھا تب وہ روس گئے وہاں سے بھی ان کو بھگایاگیا، صحیح یاد نہیں جرمنی گئے یا ترکی گئے، حجاز پر سعودی حکومت قائم ہوجانے کے بعد

مولانا حجاز چلے آئے جہاں وہ قرآن کا درس اور شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کا درس دیتے تھے، حضرت مدنی اپنے وسائل سے ہر جگہ انکی کفالت کرتے رہے۔

دیوبند میں دوسرے طلبہ کے ساتھ کئی بار ان سے ملاقات ہوئی، وہ اپنے اس سفر کے واقعات سنایا کرتے تھے، ان کی مجلس حضرت مدنی کے دولتکدہ، مہتمم صاحب کے دفتر اہتمام میں ہوا کرتی تھی جس میں میں بھی شریک ہوتا رہا، یہ ۱۹۴۰ اور ۱۹۴۱ کی بات ہے۔

..... ہمارا خیال ہے کہ ہمارے اس مضمون میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ۔ ہم نے مولانا نصرت حسین کے حالات لکھے، غالب پاشا، انور پاشا، جمال پاشا، سب ہی کو نظر انداز کیا ہے۔ والدعاء

محمد عبدالسمیع ندوی

خط نمبر ۷:

۲۵ جون - - ۱۹ء

مکرمی و علیکم السلام ورحمۃ اللہ

..... "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" اور "تبلیغی جماعت" دونوں کا کام ۱۹۲۳ء میں آریوں کی تحریک ارتداد "شدّھی سنگھٹن" کے زمانہ میں شروع ہوا۔

"جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" سیاسی اور اجتماعی طور پر "DEFFENCE" میں مشغول ہوئی ہزار ہا ہزار مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچایا، گاؤں گاؤں مکاتب قائم کئے مسلمانوں کے لئے مسجدیں بنوائیں غیر مسلم باشندوں نے جن مسلمانوں کو سرکاری مقدمات میں پھانسنے کی کوشش کی ان کی طرف سے پیروی کرکے ان کو آزاد کرایا۔ اس ضروری کام سے فراغت کے بعد جنوبی ہند اور مدھیہ پردیش میں غیر مسلم اقوام خصوصاً اچھوتوں کو اسلام کی دعوت دی سالہاسال تک تشدّد سختی اور سازشوں کے باوجود کام کرتی رہی، سیکڑوں افراد کو دائرہ اسلام میں داخل کرکے ان کی تعلیم وتربیت کا بار اٹھایا۔ جمعیۃ کے ان تمام کاموں کی سربراہی ماضی میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (۲) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی (۳)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (۴) سید غلام بھیک نیرنگ (۵) مولانا حبیب الرحمان خانصاحب شروانی (۶) مولانا سید محمد عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ (۷) حضرت مولانا شفیع الدین مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے رہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہند پاکستان تقسیم کے بعد جمعیۃ کی مجموعی ذمہ داریوں کا بار مولانا سید محمد عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ پر آگیا۔ حکومت چونکہ اس قوم کے ہاتھ میں آگئی تھی جن میں یہ حضرات دین کی دعوت کا کام کر رہے تھے اس لئے حکومت نے جمعیۃ کے کاموں کی نگرانی شروع کردی حالات سے مجبور ہوکر کام کو لٹریچر کی اشاعت میں محدود کرنا پڑا، مسلمانوں کے مصالح کے پیش نظر جن علاقوں میں کام پھیلا ہوا تھا وہاں سے سمیٹنا پڑا، اب پھر ۱۹۷۰ء سے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر دعوتی کام کا آغاز کیا گیا ہے مبلغین دورے کر رہے ہیں جائزہ لے کر حلقے بناتے ہیں لٹریچر پہونچاتے ہیں، ہمارے سامنے ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے، بالخصوص یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر کی لازمی تعلیم ہندی میں ہوتی ہے، مسلمان بچے اپنے دین سے پورے طور پر ناواقف رہتے ہیں اس کے علاوہ اکثر بچے دین کے مبادیات اور قرآن کی معمولی سورتوں سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں جمعیۃ نے اس سلسلے میں بھی لٹریچر شائع کیا ہے، اور پہونچایا جارہا ہے، موجودہ وقت میں جمعیۃ کی سربراہی حضرت مولانا محمد اویس صاحب ندوی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ فرمارہے ہیں۔ اور راقم الحروف اس کی انتظامی امور کا اعزازی نگراں ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا کام چونکہ غیر مسلم حضرات میں نہیں تھا صرف مسلمانوں ہی میں وہ اصلاح و تبلیغ احکام کر رہے تھے، اس لئے ۱۹۴۷ء کے فسادات ملکی تقسیم، حکومت سے مسلمانوں کے بیدخل ہوجانے کا کوئی اثر اس کام پر نہیں پڑا اور وہ الحمدللہ روز افزوں ہے، ...... والسلام مع الاکرام،،

دعاء کا طالب

محمد عبدالسمیع ندوی

خط نمبر ۸:

بنام دادا مولانا سید محمد عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

مخدوم ومطاع زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بھائی نبی اللہ صاحب پہونچے گرامی نامہ ملا، یہاں (ندوہ میں) کل سے ایک قصہ ٹین کی چادروں کا چل رہا ہے جب مایوس ہوگئے ہیں تب مجھ سے کہا گیا ہے چنانچہ اس سلسلہ کی ایک تدبیر افراھیم صاحب کے ذریعہ اختیار کرنے کی تھی آج وہ ملے نہیں معلوم ہوا کہ دورہ پر گئے ہیں، کل ان کو پھر فون کرنا ہے اگر وہ کل مل گئے تب تو میں یکسو ہوجاؤں گا اور کل ہی انشاء اللہ شام کو کسی وقت پہونچ جاؤں گا اور اگر کل نہ مل سکے تو ایک کوشش ۱۴ کو کرکے انشاء اللہ ۱۴ ہی کو حاضر ہوں گا۔

آج ہی کانپور سے آفسیٹ (پریس) والوں نے پلیٹوں کی تیاری کی اطلاع دی ہے، پرسوں ان کو دیکھ کر کاغذ کی خریداری کانپور میں کرنا ہے، میرے ساتھ منیجر صاحب کے صاحبزادے مولوی قمر بھی ہوں گے۔ والسلام مع الاکرام

محمد عبدالسمیع ندوی

خطوط بنام مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

خط نمبر ۱:

۱۳ ستمبر ۱۹۵۶ء

محب مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ (ملا) آپ کے فیصلہ سے بڑی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ اس تعلق کو ادارہ کے لئے بھی اور آپ کے لئے بھی ہر طرح بابرکت کرے، امید ہے کہ انشاء اللہ ادارہ کو اپنے اغراض ومقاصد میں اور آپ کو علمی ودینی حیثیت سے نفع حاصل ہوگا۔

۷-۸ اکتوبر کو جلسۂ انتظامیہ ہورہا ہے، ہم لوگ تو اس کو طے کرچکے ہیں ضابطہ سے اس جلسہ میں اس کی منظوری لے لی جائیگی اور انشاء اللہ اگلے ہی روز آپ کو تقرر کی باضابطہ اطلاع کا خط چلا جائے گا، آپ اسی روز یا اگلے روز آکر چارج لے سکتے ہیں، مولانا (محمد عبدالحی والد گرامی مولانا محمد عبدالسمیع ندوی) کی خدمت میں بہت بہت سلام، اور اس منظوری پر ان کا شکریہ۔ والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

خط نمبر ۲:

رائے بریلی

۲/دسمبر ۱۹۶۸ء

عزیز مکرم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل چند گھنٹوں کے لئے لکھنؤ گیا تھا، آپ کا خط عزیزی مولوی معین اللہ صاحب کے نام دیکھا، الحمد للہ کہ آپ کے خط سے ایک سرا ملا، ورنہ بالکل تاریکی تھی، کہ کتاب کہاں ہے، کس منزل میں ہے، اب آپ اتنی اور سعادتمندی، اور

عنایت کیجئے، چودھری صاحب سے کہئے کہ بلا تاخیر کاپیاں پلیٹوں پر جموادی جائیں، مقدمہ کا انتظار نہ کیا جائے، مقدمہ صرف دو صفحہ کا ہوگا، زیادہ سے زیادہ اس کے لئے پہلی پلیٹ روک لی جائے، اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے، اس کے لئے کام میں ہرگز تعویق نہ کی جائے، مجھے فہرست عناوین بھیجنے کی ضرورت نہیں، آپ اپنے سامنے ہی پریس سے معاملہ کرادیجئے، اور کام کا سلسلہ شروع کرا آیے، یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہوگا، میں مقدمہ عید کے بعد بھیج سکونگا، آپ چودھری صاحب کا پتہ مجھے لکھ کر بھیج دیجئے۔

ندوہ کے سلسلہ کے خطوط کی ہدایت کر آیا ہوں، انشاء اللہ وہ آپ کو پہونچ جائیں گے۔ والسلام، دعاگو

ابوالحسن علی

خط نمبر ۳:

رائے بریلی

۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء

عزیز گرامی! سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! عزیزی مولوی معین اللہ صاحب کے لفافے میں آپ کا مفصل اپنے نام خط پڑھا، اس سے پہلے میں براہِ راست آپ کو ایک خط لاہور کے پتہ پر بھیج چکا ہوں، جس میں آپ کی مساعی کا شکریہ ادا کیا تھا اور لکھا تھا کہ مقدمہ کا انتظار کئے بغیر کاپیاں پلیٹوں پر جموادیجئے، اگر اس میں تاخیر ہوئی تو پھر معاملہ کھٹائی میں پڑجائے گا، اب آپ کا دوسرا خط ملا، میں نمبر وار آپ کے سوالات کا جواب دیتا ہوں:

۱- فہرست کا کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے، کوئی حرج نہیں لیکن پہلے حصے سے مطابقت کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلے ہی طرز کو اختیار کیا جائے۔

۲- قلمی کتابوں کے حوالے نہ ضروری سمجھے جاتے ہیں نہ چنداں مفید، اس لئے اس کی وجہ سے کام میں تعویق وتطویل نہیں ہونی چاہئے، اس کو اسی طرح رہنے

دیجئے۔

۳- "سیرت سید احمد شہیدؒ" سے مراد ہماری کتاب ہے، اور صرف "سید احمد شہیدؒ" سے مراد مہر صاحب کی کتاب ہے۔

۴- یہ معلوم کر کے کہ مسودہ میں جگہ جگہ اصلاح کی گئی ہے سخت کوفت اور تشویش ہوئی، اس کا کوئی جواز نہیں ہے، میں تو اس کو پڑھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ معلوم نہیں کہاں کہاں تصرف کیا گیا ہوگا؟ یہ تو وہی "خرّ موسیٰ صعقا" کی اصلاح کا قصہ ہے، کہ کاتب صاحب نے خیال کیا کہ خرِ عیسیٰ مشہور ہے، خرِ موسیٰ تو کہیں نہیں سنا، اس لئے "خرّ عیسیٰ صعقا" کردیا، مولانا خرّم علی صاحب بلہوری کی نظم اُس زمانہ کی زبان میں ہے، اس میں اصلاح کا حق کسی کو نہیں ہے، یہ تو صریح تحریف ہے، آپ ساری اصلاحات کو ختم کر کے نظم کو مطابق اصل بنا دیجئے ورنہ تنقید کرنے والوں کے اعتراضات کا جواب نہ بن پڑے گا، یہ بدعت آخر کس کو سوجھی، کیا میر و سودا کے کلام کی بھی اصلاح کی جائے گی، اور ان کا دیوان اِس زمانہ کے محاورات کے مطابق شائع کیا جائے گا؟

جو لوگ اصل نظم یا مہر صاحب کی کتاب میں اس کو پڑھیں گے وہ میرے اس تصرف بے جا کو کیا کہیں گے؟ اس تجربہ سے یہ سبق لیا کہ اپنی کوئی کتاب کبھی پاکستان کے لوگوں کو نہیں دینی چاہئے، بہرحال کسی طرح سے اس کتاب سے فرصت ملے۔

کتاب شوشہ شوشہ، اور نقطہ نقطہ بالکل مسوّدہ کے مطابق ہونی چاہئے، البتہ سرحدی مقامات کے نام اگر غلط ہوگئے ہیں تو مولانا سیاح الدین صاحب کی رائے کے مطابق ان کی تصحیح کردینی چاہئے، اور کہیں تبدیلی کا کسی کو کوئی اختیار نہیں،......

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و صلاح میں برکت دے کہ سیرت کے سلسلہ میں آپ ہی نے کچھ کیا، وقتاً فوقتاً اگر آپ حالات سے مطلع کرتے رہیں تو بہت اچھا ہوگا۔

والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

خط نمبر ۴:

شعبہ تعمیر و ترقی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۵ رمضان ۱۳۸۸ھ

محب مکرم زید لطفہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ یہاں سب ڈاک بھی آپ کو مل رہی ہوگی، ..... رات میں حضرت مولانا کا گرامی نامہ موصول ہوا حسب طلب سب خطوط حضرت مولانا نے آپ کو روانہ کردیئے ہیں لاہور ہی کے پتہ پر، ان خطوط کا ضرور انتظار کریجئے گا ..... سیرت کے بارے میں حضرت مولانا کا گرامی نامہ ایک تو آپ کو مل ہی گیا ہوگا، دوسرا بھی شاید اس خط کے پہلے ہی مل جائے، مکتبہ اور مجلس کی کتابوں کے بارے میں ذرا اندازہ کیجئے کہ کوئی صورت کسی کو دینے کی ہوسکتی ہے، بہت ہی معتبر آدمی کی ضرورت ہوگی، وہاں کوئی بات سمجھ میں آئے تو لکھئے گا۔ والسلام

معین اللہ ندوی

خط نمبر ۵:

۱۵ اپریل ۱۹۵۸ء

مجی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ آپکا طویل مراسلہ ملا۔ آپ نے اپنی بھر کوشش کردی اب نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کراچی بڑا غدار اور بے وفا شہر ہے وعدوں پر کم بھروسہ رکھیں فاصلوں کی دوری کی وجہ سے ایک دن میں صرف ایک شخص سے ملاقات ممکن ہے۔ اگر آپ کو عطیہ فیضی وغیرہ کے وعدوں پر کچھ یقین ہو تو ان حضرات کو ایک بار اور دیکھ لیں اور بس نیا کام اب بالکل نہ چھیڑیں۔ پرانے وعدہ کو ایفاء کرانے کی کوشش کریں اور اس میں بھی دو ایک بار کے بعد اگر ناکامی ہو تو زیادہ پیچھے نہ پڑیں۔ بہتر یہی تھا کہ آپ مدرسہ کھلنے سے دس بارہ یوم پہلے آجاتے، اس سال ۷ شوال کو ئے طلبہ کا داخلہ شروع ہوجائیگا، اور ۲۱ شوال سے تعلیم شروع ہوجائیگی، آپ کسی طرح ۹ / ۱۰ شوال سے آجاتے تو بہتر تھا، مولوی معین اللہ صاحب

رائے بریلی گے ہیں عید وہیں کرینگے۔ والسلامُ،، ابوالعرفان ندوی
(قائمقام مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء)

خط نمبر ۶:

۶ مارچ ۱۹۸۲ء

مکرمی جناب مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی ،، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
خدا کرے آپ بخیر ہوں، کل ہی آپ کا خط اور احمد خاں صاحب کی جانب سے "رو داد چمن" موصول ہوئے، آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ اس معاملہ میں تعاون فرماتے رہتے ہیں، اس سے پہلے بھی آپ کا خط جس میں آپ نے "ندوۃ العلماء" کے اجلاسوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی تھی مل گیا تھا، شکریہ۔
" ..... " عبدالرشید صاحب (ندوی ریاض) سے کبھی کبھی خط وکتابت ہوتی رہتی ہے۔ "ندوۃ العلماء" کی تاریخ کی طرف آپ لوگ توجہ کیوں نہیں فرمارہے، یہ تو نہایت ہی اہم کام ہے اس طرف تو فوری توجہ ہونا چاہئے، میں نے اپنی کتاب "انجمن اسلامیہ" کے تین ابواب مکمل کرلئے ہیں۔ اس میں دوسرا باب "انجمن اسلامیہ اور ندوۃ العلماء" سے متعلق ہے ، انشاء اللہ اس مضمون کو علیحدہ بھی شائع کروں گا تب ایک کاپی آپ کو ضرور ارسال کروں گا۔ والسلام

آپ کا مخلص

احمد سعید

ایم، اے، او، کالج، لاہور

خط نمبر ۷:

۴ ستمبر ۱۹۷۰ء

برادر مکرم . سلام وتحیات ! آپ سے میں تھوڑا سا ناراض ہوں، آپ نے یہاں آنے کا وعدہ کیا، اس خوشخبری پر فوراً کارڈ لکھا کہ زہے قسمت آیئے اور آنے کی تاریخ سے مطلع کیجئے، لیکن خاموشی مسلسل خاموشی ..... ! آپ اپنے اہتمام میں "ارکان اربعہ" کا اردو ترجمہ مکتبہ سے نیز "روائع اقبال" کا ترجمہ مندرجہ

ذیل پتے پر بھیج کر مجھے قیمت مع محصول ڈاک لکھ بھیجئے اسی میں سابق ایک روپیہ بھی شامل کر دیجئے میں آپ کا خط پاکر فوراً آپ کے نام منی آرڈر کروں گا ......

والسلام

جلیل احسن (ندوی)

خط نمبر ۸:

۲ جون ۱۹۷۲ء

چوک، سہاور، ایٹہ

مکرمی سلام مسنون! آپکا بھیجا ہوا عنایت نامہ موصول ہوا۔ مولانا علی میاں صاحب کا پروگرام معلوم ہوا۔ برائے مہربانی مولانا صاحب کے بارے میں تحریر فرمائیں کہ موصوف لکھنؤ یا رائے بریلی کب تک تشریف لارہے ہیں۔

میں مولانا سے جس کام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں بہت دن سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنے کے متعلق انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ جو تعمیری مقاصد کا حامل ہو اور جس کے ذریعہ مسلمانان ہند کے مسائل اور مطالبات ہی ظاہر نہ کئے جائیں بلکہ ان کے اندر تعمیری رجحان اور خود نگری کا جذبہ پیدا کرنے کی بھی انتھک کوشش کی جائے۔

ندوہ سے نکلنے والا پندرہ روزہ "تعمیر حیات" اپنے نام اور اغراض ومقاصد کے اعتبار سے میرے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہے۔ جناب والا کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ تعمیر حیات کو بند کرنیکی بات سوچی جارہی ہے۔ چنانچہ میں مولانا علی میاں صاحب سے یہ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ میری اسکیم اور کوشش وکاوش کے ذریعہ اخبار ہذا اللہ کے حکم سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے تو اس مفید اور باوزن اخبار کو مستقل طور پر کیوں نہ جاری رکھا جائے۔ میرے خیال میں کوئی نیا اخبار جاری کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ کسی جاری شدہ اخبار ہی کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں مولانا سے گفتگو کروں یا نہ کروں؟

تعمیر حیات کے بارے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی کتنی کاپیاں چھپتی ہیں؟ مستقل خریدار کتنے ہیں سالانہ مصارف کیا ہیں؟ اس کے ایڈیٹر کو کیا مشاہرہ ملتا ہے؟ اور دارالعلوم اس کی اشاعت پر کتنا سرمایہ صرف کرتا ہے۔

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بعافیت ہونگے۔ اس عریضہ کے جواب سے جلد مطلع کرنے کی زحمت فرمائیں۔ تعمیر حیات کو بند کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جارہا ہے؟

نیاز مند

محمد اللہ خاں

خط نمبر ۹:

۲۸ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ

محمد ارشد اعظمی

معرفت جناب ڈاکٹر محمد ظفر صاحب

اردلی بازار بنارس - ۲

مکرمی مخدومی حضرت گرامی دام عنایتکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آنمخدوم کا مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کے دونوں مکتوب گرامی سے نظر افروز ہوا۔ اور بے پایاں مسرت ہوئی۔ آپ ہمارے بزرگ ورہنما ہیں جس خامی کی آپ نشاندہی فرمائیں گے اس میں ہماری بہتری ہوگی اس سے ہماری اصلاح ہوگی اور ان شاء اللہ ترقی کی راہیں کھلیں گی آپ بلا تردد اپنی گرانقدر آراء اور مشوروں سے نوازتے رہیں آپ ہمارے والد محترم کی طرح ہیں جو رائیں آپ نے دی ہیں اس میں مجھے شفقت اور پیار نظر آیا۔ اللہ تعالی مجھے آپ سے استفادہ کرنے اور ترقی کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ دراصل وہ عربی مضمون مجھے بہت ہی پسند آیا اس بناء پر اس کا ترجمہ کیا لیکن ناتجربہ کار اور خامکار ہونے کی وجہ سے اس حقیقت تک رسائی نہ ہوسکی جس کی ضرورت تھی۔ ان شاء اللہ آپ کے بتائے ہوئے اصول ومشوروں پر عمل کرونگا۔ میرا جو بھی مضمون آپ کے پاس

جایا کرے جو خامیاں اس میں نظر آیا کریں آپ ضرور اس سے مطلع کریں میں انشاء اللہ اس کا لحاظ اور خیال کرونگا۔

کچھ مضامین زیر ترتیب ہیں انشاء اللہ اس کو مکمل کرنے کے بعد روانہ کروں گا۔ ایک بات بہت ہی محبت اور عاجزی سے آپ سے عرض کرونگا اگر آپ اسے کردیں گے تو عین نوازش ہوگی اور اگر نہ ہوسکے تو کوئی بات نہیں وہ یہ کہ اگر ہوسکے تو گاہے بگاہے میرے نام "الرائد" روانہ کردیتے تو مطالعہ کا موقعہ ملتا کیونکہ اس کے مطالعہ سے محروم ہوں۔ اگر آپ کو اس میں ذرا بھی دقّت ہو تو کوشش نہ فرمائیں۔ بقیہ سب خیریت ہے آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں اور آپ کی محبت وشفقت کا طالب ہوں۔ والسلام،، محمد ارشد عفااللہ عنہ

(موصوف کے مضامین تعمیر حیات میں چھپتے رہتے تھے، اسی سلسلہ کا یہ خط ہے)

خط نمبر ۱۰:

۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء

مولانا المحترم، دامت برکاتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نوازش نامہ موصول ہوا، سنٹرل جمعیۃ تبلیغ الاسلام کانپور کی خدمات کی اطلاع ملی، جناب کا بہت بہت شکریہ! اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ آپ کی عمر میں، آپ کے کاموں میں برکت عطا فرمائیں، اور آپ سے اپنے دین کی خدمت لیں۔ آمین

آپ کے لٹریچر کا انتظار ہے، آپ کی جمعیت تبلیغ الاسلام کو میری جانب سے اجازت ہے اور اس کا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنے طور پر مناسب انداز میں اپنے صواب دید پر "اسلام کا عالم گیر پیغام" کا ترجمہ کرائے اور اس کی اشاعت کرائے۔

آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں، دعاء کردیں کہ اللہ حسن خاتمہ نصیب کرے اور ایمان پر خاتمہ ہو..... والسلام

ناچیز عبدالصمد رحمانی

مانڈر، وایا کھگڑیا، ضلع مونگیر

خط نمبر ۱۱:

مراد آباد، ۷ اگست ۱۹۷۲

محترم مولانا! السلام علیکم! مزاج گرامی! کرم نامہ ملا علالت کا حال معلوم ہوکر فکر و قلق ہے، حق تعالی صحت کاملہ مستمرہ عطا فرمائے اب طبعیت کیسی ہے۔ لکھنؤ کب تشریف لے جائیں گے۔

اکابرین کی مشاورت اگر جمیعۃ تبلیغ کی طرف سے منعقد ہوئی تو انشاء اللہ بہت خیر کی توقع ہے، اور کانپور ہی میں رکھی جائے بساطی بازار کے حلقے میں حضرت قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے معتقدین و مریدین بھی حضرت علی میاں صاحب کے تعلق والے بھی ہیں، تقریباً ۲۵ حضرات کو مدعو کیا جائے گا جس میں دس پندرہ ہی مہیا ہوسکیں گے، امید ہے کہ ملّت کی راہ عمل اور فکر ان کے ذریعہ حاصل ہوسکے گا، آپ اس پر استخارہ کریں پھر کچھ ہمدردوں سے مشورہ کریں پھر اس کا پروگرام بنانے اور اخراجات کا تخمینہ کرنے دعوت نامہ جاری کرنے میں بندہ آپکا پورا پورا تعاون کریگا، ابھی تو حالات ایسے ہیں لیکن آئندہ شاید اس طرح سوچنے اور جڑنے کا بھی موقع نہ مل سکے۔ بہر حال جمعیۃ اپنے مقصد کے اعتبار سے اس اقدام کے ذریعے اس دور کے لئے ملّت کی بقا کا عظیم کام انجام دیگی۔ خدا اس کو آسان فرمائے۔

سوامی صاحب سے میری ملاقات آج تک نہیں ہوسکی ہے جب میں نے خط لکھے تو اس کا جواب بھی نہیں آیا اس لئے خط وکتابت بھی نہیں ہوسکی ہے۔ حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی ؒ نے تعارف کرایا ہوگا، سوامی صاحب کاندھلہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت ہوئے، مولانا ان سے متاثر تھے۔ مولانا کو جو خط لکھا تھا وہ بھی میں نے دیکھا ہے، چونکہ کرنال سے باہر چلے گئے تھے اس لئے مولانا سے بھی مجھ سے بھی خط وکتابت نہ ہوسکی بہرحال ظاہر حالات سے مخلص ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ کرنال جاکر ان سے ملا جائے تاکہ وہاں ان کی صحیح نوعیت معلوم ہوسکے۔

اگر مولانا علی میاں صاحب سے ان کا جوڑ ہوجائے تو انشاء اللہ بہت مفید

ہوگا، آپ انھیں مولانا سے مشورہ کر کے لکھنو بلائیں، .... فریدی

خط نمبر ۱۲:

۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء

۱۸- پائیس اسٹریٹ، بالکلہ، بمبئی

جناب ندوی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا روانہ کردہ لفافہ موصول ہوا پڑھ کر حالات سے آگاہی ہوئی، ..... ۔

ہیرا لال گدھی اکثر وبیشتر بمبئی میں ملتے رہتے ہیں، آج بھی وہ ہیرا لال گدھی کے نام سے لوگوں میں جانے جاتے ہیں، ہم کو اپنی مذہبی تعلیم کو لوگوں میں عام کرنا ہے تاکہ وہ اپنے طور پر اسلام قبول نہیں کر سکتے تو کم سے کم خیالات ہی مسلمانوں کے بارے میں بدل دیں تو بھی بہتر ہے، پرسان حال کو دعاء وسلام عرض کریں، کارلالکھ سے یاد فرمائیں، زیادہ کیا لکھوں۔ فقط،، عبدالمجید دھولپوری

خط نمبر ۱۳:

مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۲ء

مکرم ومحترم سلام مسنون

ضروری گزارش عرض یہ ہے کہ آپ کا روانہ کردہ مسائل عیدالاضحیٰ قربانی دس عدد موصول ہوا ..... یہاں کے گورنر حاجی عبدالرحمن یعقوب سے دعوتی طور پر انگریزی یا عربی میں خط وکتابت کریں اور اگر کوئی خاص بات قابل ذکر ہو تو اس غریب کا نام ظاہر کرنے میں ذرا بھی قباحت نہ محسوس کریں میں مجبور ہوں کہ انگریزی بہت مختصر اور عربی مفہوم بالکل نہیں اور یہاں کی زبان صاف طور پر (بولنے سے) معذور ہوں گورنر بیچارے مسلمانوں کو جگانے کے لئے بڑی جد وجہد کر رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ طریقہ سے ناواقف ہیں، اللہ رحم کرے اور آپ لوگوں کو اور ہم سب کو دین پر استقامت نصیب فرمائے، مگر حاجی عبدالرحمن سے ضرور خط وکتابت کریں ..... ۔ فقط والسلام،، عبدالستار بقلم خود عفا اللہ عنہ

پوسٹ بکس ۳۳۴، میری سراوک، ملیشیا وایا سنگاپور

خط نمبر ۱۴:

یکم جون ۱۹۷۲ء

مکرمی سلام مسنون!

ضروری تحریر یہ ہے کہ آپ کا گرامی نامہ مع پانچ قرطاس رکنیت اور بعد میں آپ کی مرسلہ تین کتابیں انگریزی "کتاب الصلاۃ" موصول ہوئیں ..... مزید یہ کتابیں درکار ہیں اس کی جو مناسب شکل ہو تجویز فرمائیں "اسلامی عقیدے" کا ترجمہ اگر آپ انگریزی زبان میں کر کے ہم کو ارسال فرمائیں تو ہم اسکا مقامی زبان میں ترجمہ کرواکر آپ سے مزید تعاون کریں، کیونکہ اردو یا عربی سے ترجمہ بڑا مشکل کام ہے آپ نے جو خط یہاں سربراہوں کے نام ارسال فرمائے ہیں یہاں کے امام صاحب نے اس خط کو میرے حوالہ کردیا بالآخر میں نے اس کا ترجمہ مقامی زبان میں کرواکر ان کو دیا اس کی دو نقلیں آپ کو بھی ارسال کررہا ہوں فی الحال ضرورت ہے مبلغوں اور جماعتوں کی، اس کی کوئی بنیادی شکل نہیں نظر آرہی ہے مزید جن جن کتابوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہے اس کی ایک ایک کاپی ہم کو ارسال فرمادیں تو بہتر ہے تاکہ ہم اس کا ترجمہ کرواسکیں اگر تبلیغی نصاب کا انگریزی ترجمہ موجود ہو تو ضرور روانہ فرمائیں کیونکہ نماز اور دوسرے مسجدوں والے اعمال سے یہاں کی مسجدیں بالکل ویران ہیں ...... اگر آپ کتابوں کے ترجمہ کے سلسلہ میں علی بھائی شرف علی مالکان تاجران کتب خانہ مجگاؤں بمبئی سے رابطہ قائم کریں تو بہتر ہے، کیونکہ ان کے یہاں کے چھپے ہوئے چند قرآن پاک یہاں پر ہیں جن میں جاوی حروف میں شروع کے سولہ صفحے شامل ہیں ان کو یہ چیز کہاں سے ملی ..... بلا راہبر کے کوئی خاص نتیجہ کی کوئی امید نہیں ویسے اگر راہبر آپ یہاں مقرر کریں تو تقریباً کیا خرچ پڑے گا ماہوار؟ اور گورنمنٹ کی طرف سے کیا کیا دشواریاں پیش آویں گی یہ بعد میں دیکھا جاوے گا، خدا کرے کی کوئی معقول انتظام ہوجاوے دعاء فرماتے رہیں ..... باقی سب خیریت ہے، فقط والسلام،، عبدالستار بقلم خود عفااللہ عنہ

خط نمبر ۱۵ :

۱۹۷۲/۶/۲۱ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' !

آپکا خط ملفوف محررہ ۱۴ جون ۱۹۷۲ء موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ کمین سال قبل جبکہ ہماری شاخ سنگاپور میں تھی تو میں نے جاوا کے لئے جاوی زبان میں قرآن شریف کا مقدمہ جاوا کے کسی مولوی صاحب سے کروایا تھا لیکن افسوس کہ اب سنگاپور سے اپنا کاروبار اور شاخ (برانچ) کو ختم کردیا ہے۔ اس لئے ہم قطعی مجبور ہیں اور نہ یہاں کوئی جاوی زبان میں کوئی ترجمہ کرنے والا ہے۔ امید کہ کسی طرح کا خیال نہ فرمائیں گے۔ فقط والسلام

منیجر

علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی پرائیوٹ لمیٹیڈ، بمبئی

خط نمبر ۱۶ :

۱۲ اپریل ۷۲ء

محترم ومکرم جناب مولانا صاحب مدظلہ العالی ،، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

..... جو نو مسلم صاحب یہاں تشریف لائے تھے ان کا معاملہ خاصا پرفریب ثابت ہوا ۔ اور اندازہ ہوا کہ اس شکل میں بہت سے پرخطر لوگ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے ، ان کی کمزوریوں کا پتہ لگانے ، ان پر ضربیں لگانے اور ان کے اخلاقی بگاڑ میں اضافہ کرنے کے لئے گھس آئے ہیں ۔ اس لئے بہت پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے ، پچھلے نومبر میں سیونی کے اندر فساد کی اطلاع آپ کو ملی ہوگی ، اس میں ان حضرت کا بھی خاصا دخل بتایا جاتا ہے ----- فساد سے کچھ قبل یہ اچانک غائب ہوگئے اور اب بھی لاپتہ ہیں ----- اللہ مسلمانوں کو حفظ وامان میں رکھے ۔ والسلام

صفی الرحمان الاعظمی

خط نمبر ۱۷:

یکم اپریل ۱۹۷۲ء

آدرش پبلک اکڈیمی

مہوبہ، ہمیر پور

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپکا ۲۷ مارچ کا لکھا نامہ ۳۰ مارچ کو آفس میں رکھا ہوا ملا پڑھکر بہت خوشی ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ شاید راہبر مجھے اب ملا میں جس کی تلاش میں تھا وہ شاید آپ ہیں ..... (میں نے) باسٹھ بیگھ زمین اسکول کے نام کردی ہے میرے اسکولوں میں قریب سولہ ماسٹر اس وقت کام کر رہے ہیں اس میں درجے الف سے ۸ تک ہے، دونوں اسکول رگکنا ئزڈ ہیں ..... اس کو کھولنے کا میرا مقصد صرف نام کرنا یا دیگر زبانوں کو یا صرف اردو زبان کو پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ اسلام جس کے نام سے آج صرف ہندو ہی نہیں ہم سب بہت دور ہیں سے واقفیت کروانا (ہے)۔ اور حضرت میں نے تو اپنے آپکو اس کام کے لئے تن من دھن ہر طرح سے لگادیا ہے کیونکہ یہ سب میرا نہیں ہے بلکہ ہمارے امتحان کے لئے ہمیں دیا گیا ہے۔

میں اور کیا لکھوں اس وقت آپکا مجھ سے تعارف ہونا میرے لئے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن گیا ہے بس اب یا تو آپ وقت نکالیں تو مہوبا آکرایک نوجوان بھائیوں کی ایک جماعت بنا جائیں ..... جب آپ آئیں تب خبر کردیں تاکہ میں تمام لوگوں کو خبر کردوں امید ہے آپ میری اس دعوت کو قبول فرمائیں گے اور جلد از جلد اپنے آنے کی خبر دینگے دن اتوار کا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ آپ کے انتظار میں۔

آپ کا ہی چھوٹا بھائی

محمد رشید خان

خط نمبر ۱۸ :

۲۷ جون ۱۹۷۲ء

کٹرہ شہاب خاں، اٹاوہ

مکرمی جناب مولانا عبدالسمیع صاحب مد ظلہ، سلام مسنون

آپکا گرامی نامہ ملے بہت دن ہوگئے۔ آپ تبلیغی اشاعتی کام میں مشغول ہو گئے۔ خداوند تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔ دو سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب سے میں دورہ قلب کا مریض ہوں Heart Attack کی وجہ سے محنت کا کام بالکل نہیں ہوتا، یہ کام بہت جفاکشی چاہتا ہے۔ کوئی کلرک نہ ہو جب تک میں کام نہیں کرسکتا، رائے دے سکتا ہوں، اسلامیات کا ترجمہ ہندی میں دراصل بہت مشکل کام ہے اس میں بڑی لغزش ہوجاتی ہے اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے اسلئے مجھے آپ جواب دیر میں دینے کے لئے اور تعمیل ارشاد نہ کرسکنے میں معذور سمجھ کرفی الحال معاف فرمائیں۔ والسلام احقر فدا حسین

خط نمبر ۱۹ :

۲۹ جنوری ۱۹۸۰ء

مالیگاؤں

محترمی ومکرمی مولانا عبدالسمیع صاحب السلام علیکم !

بعد سلام مسنون کہ ..... دعوتِ تبلیغ کا کام حقیقتاً بڑا ہی مشکل کام ہے میں بھی اس کام میں حتی الامکان کوشش کرتا رہتا ہوں۔ حال میں تقریباً ۶۲ سکھ حضرات بمبئی میں مسلمان ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ اسلام پر قائم ودائم رکھے۔ (آمین) انھیں نومسلم حضرات میں سے ایک صاحب مالیگاؤں آئے تھے افسوس کہ ان سے ملاقات نہ ہوسکی، البتہ ان کا پتہ دوسرے حضرات سے معلوم ہوا کہ وہ کانپور میں رہتے ہیں، ازراہِ کرم معلوم کر کے لکھیں وہ صاحب کانپور میں ہیں یا کہ نہیں تاکہ میں ان سے خط وکتابت کرسکوں۔ فقط آپ کا خیر خواہ،،

سمیع اللہ سیتاپوری

خط نمبر ۲۰:

۵ فروری ۱۹۸۱ء

۱۵۲۵ سوئی والان جامع مسجد، دہلی

مکرمی! سلام مسنون،، محکمات جنوری کے شذرات میں آپ نے بات بالکل صحیح کہی ہے کہ ملک میں سرخ آندھی کے بڑھتے ہوئے قدموں پر سوچ سمجھ کر ابھی سے روک لگانے کی ضرورت ہے۔

..... آپ کے شذرہ کا یہ حصہ سہ روزہ دعوت میں نقل کیا جارہا ہے (ضیاء الحسن) فاروقی صاحب کے متذکرہ مضمون (اسلامی فنڈامینٹل ازم) کے بارے میں آپ مولانا علی میاں مدظلہ کی رائے بھی ضرور معلوم کریں اور ممکن ہو تو عاجز کو بھی اس سے مطلع کریں۔

پرواز رحمانی

خط نمبر ۲۱:

دفتر دارالقضاء امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

مدرسہ رحمانیہ سوپول ڈاکخانہ بیرول ۔ دربھنگہ

۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء

محترم گرامی قدر جناب مولانا عبدالسمیع ندوی المحترم سلام علیکم طبتم سواء غبتم او حضرتم

خدا کرے آپ اچھے ہوں، آنجناب کی جو علمی، دینی، اور دعوتی مساعی چل رہی ہیں اللہ پاک اسے قبول فرمائے اور دین کی دعوت واشاعت کے لئے علماء امت کو متوجہ کرے آمین۔

جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی جانب سے جو "محکمات" پرچہ شائع ہورہا ہے اس کے ایک شمارہ کے مطالعہ کا موقع ملا ------- یہ پرچہ جولائی واگست ۱۹۸۰ء کا ہے اسکے مختلف مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ رسالہ دعوت کے ساتھ صالح

اور اہم مضامین پر محتوی ہے، میں تو مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ میں ایک خادم درس اور قاضی امارت شرعیہ کی حیثیت سے کام کررہا ہوں، لیکن میں ایک چھوٹے اور قدیم طرز کے دیہات کا باشندہ ہوں ایسی بستی میں میرا گھر ہے جو شہر کے رست وخیز سے الگ پرانے فکر وتہذیب بلکہ بدویت، واعرابیت کی جہالت کا گہوارہ ہے مل ملاکر بس دو تین عالم وحافظ ہیں جو اپنی معاشی مشکلات کی بنا پر دور دراز حلقوں میں پڑے ہوئے ہیں نہ کوئی تدریس کا نظم ہے اور نہ علمی ماحول، نہ بزرگوں کی آمدو رفت کی وجہ سے کچھ ایمانی اخلاق اور دینی احساسات ہیں، ایسی پسماندہ محدود آبادی جو غیر مسلموں کی اچھی خاصی آبادی کے گوشے میں مقید ہے طرح طرح کے مسائل ہیں، تہذیب واخلاق میں ملاوٹ، عقیدہ وعمل کا اختلاط، معاشرتی امور میں تو اور بھی ضم ہوچکے ہیں، ------ اب ایسی صورت میں دو دوستوں کی رائے یہ ہوئی کہ ایک دینی وعلمی مکتب سے ماحول میں کچھ سعی چلائی جائے۔ تاکہ ایک طرف مسلمانوں میں کچھ دینی فکر کا احیاء ہو، دوسری طرف غیر مسلموں کے بھیانک ماحول میں ان سے نبرد آزمائی کے بجائے ان کے تشدد پسندانہ ذھنیت کو کم کیا جاسکے یہ گوالہ (بھینس پالنے والی) برادری ہے ------ ان پر بھی جہالت، مال کی کثرت اور مزاجی تشدد غالب ہے ان حالات میں آپ سے چند گزارش ہے۔

۱۔ مسلم آبادی جو پچاس پچھتر گھر سے زیادہ نہیں تہذیب ومدنیت سے کوسوں دور ہے اس میں کس ترکیب سے کیا کام ہو، اور "مکتبہ طیبہ" کا کس نہج سے آغاز ہو جبکہ دو میل ایک میل کی دوری پر بریلوی فکر والے اپنی راگ الاپ رہے ہیں۔

۲۔ غیر مسلم بھائیوں کے پھیلے ہوئے افراد سے کس طرح خوشگوار رابطہ ہوگا جبکہ تھوڑی زمین، مال مویشی وغیرہ کے نقصانات سے اشتعال ہوتا رہتا ہے۔

۳۔ اس "مکتبہ طیبہ" کے ذریعہ دین کی نشر واشاعت کے لئے قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم کو اساس کی حیثیت سے شروع کرنا ہے -- بچے سب مقامی

ہونگے۔

۴۔ آپ اپنی دعاؤں کے ساتھ کچھ مناسب مشورہ اور علمی تعاون سے ان دور افتادگان نوخیز جوانوں کی سرپرستی فرمائیں۔

۵۔ بہار واڑیسہ کے امیر شریعت دامت برکاتہم کی خدمت میں بھی صورت حال لکھ رہا ہوں۔

۶۔ اگر دینی مکاتب کے نام "محکمات" اعزازی طور پر اجراء فرماسکتے ہوں تو حسب ذیل پتہ پر روانہ فرمادیں انشاء اللہ اسطرح کچھ دینی ذہن بنے گا۔

ان چند گزارشات کے ساتھ دعاء کا محتاج ہوں اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں میں، کاموں میں قبولیت وبرکت دے۔ والسلام"

محمد قاسم المظفرپوری

خط نمبر ۲۲:

۶۸ چھاؤنی - کانپور

۲۸ جنوری ۱۹۸۱ء

برادرم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپکا ۶ ماہ حال کا محبت نامہ وقت سے مل گیا تھا اور پوسٹ پیکٹ بھی ۱۰ جنوری کو۔ گوناگوں الجھنوں اور چند اعزاء کی تشویشناک علالتوں کے باعث پیکٹ کھولنے کی نوبت نہ آئی سمجھا تھا کہ اسمیں محکمات کے وہ شمارے ہونگے جو میرے پاس نہیں۔ اللہ کے فضل سے آج قدرے سکون ہوا تو آپ کا خط جو PENDING FILE میں تھا دوبارہ پڑھا اور پیکٹ کھولا بخدا دل خوش ہوگیا۔ جو کتابچے آپ نے ازراہِ محبت بھیجے ہیں ان میں سے دو سٹ علی میاں کے تو میرے پاس پہلے ہی سے ہیں اور بقیہ اضافہ ہیں۔ آپ کی محبت میں شبہ تو مجھے کبھی نہیں تھا لیکن آج یہ یقین ہوگیا کہ ابھی کوئی ھے اور اللہ اس کی عمر دراز کرے جو ان خلوں کو پورا کرتا رہیگا جو مجھ میں باقی ہیں۔ جزاک اللہ۔

برادرم اب آپ جلد ملاقات کریں اس لئے کہ زندگی کا بھروسہ نہیں اور قرض کا بار اب زیادہ ہوگیا ہے۔ اچھا تو برخوردار ڈاکٹر خالد راشد سولیجہ ایم - ایس

(لکھنو) ڈبل ایف - آر - سی - ایس (امریکہ) آپ کو یاد ہیں۔ مجھے یاد آگیا کہ آپ کا کچھ کام انھوں نے میڈیکل کالج میں کیا تھا اور آپ نے شکریہ اور دعاؤں کا خط مجھے لکھا تھا۔ وہ دعائیں برخوردار کے کام آگئیں، ماشاء اللہ گیارہ سال سے امریکہ میں ہیں اور بہت کامیاب، وہیں کے باشندہ ہیں میں برابر انھیں اسلامیات پر اچھی کتابیں بھیجا کرتا ہوں۔ والسلام

عبدالحی سولیجہ

خط نمبر ۲۳:

ہند، سی. سی. ورکس، مئو ناتھ بھجن، اعظم گڑھ

۱۴ دسمبر ۱۹۸۴ء

گرامی قدر جناب سید عبدالسمیع صاحب ندوی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب گرامی مورخہ ۱۱ دسمبر آج موصول ہوکر کاشف احوال ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ! بفضلہ تعالیٰ آپ کی دعاؤں سے ہمارا ذاتی کسی طرح کا نقصان نہیں ہوا لیکن اپنے مسلم بھائیوں کا کافی نقصان ہوا جسے میں اپنا ہی نقصان تصور کرتا ہوں "کل مؤمن اخوۃ" کے تحت ایک قیامت تھی جو گذر گئی، بغیر کسی جواز کے کرفیو لگادیا گیا پورے قصبہ مئو کا جس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہوگی، جہاں پر تقریباً ۸۰ فیصد مسلمان ہیں۔ کرفیو لگاتار تقریباً تین ہفتہ تک جاری رہا غالباً ہفتہ عشرہ کے بعد کرفیو میں چھوٹ کا اعلان ریڈیو سے کیا جانے لگا لیکن وہ اعلان غلط وفرضی رہا کرتا، دوران کرفیو دھان کی تیار فصل جو تقریباً ڈیڑھ سو بیگھہ تھی سب مسلمانوں کی تھی غیر مسلموں کی طرف سے پوری فورس وحکامان ضلع وصوبہ کی زیر نگرانی کاٹ لی گئی، اسی کے ساتھ آب پاشی کی قیمتی موٹریں، پمپنگ سیٹ، ٹیوب ویل، سارے نکال لئے گئے، بہت سارے کارخانوں اور موٹر کاروں وغیرہ کو لوٹنے ونقصان پہنچانے کا کام انجام دیا گیا، ایک بہت بڑا "عالیہ" جنرل اسپتال جو تقریباً ڈیڑھ سال سے زیر تعمیر تھا اور یہ مئو کے سب سے بڑے چوراہے مرزاہادی پورہ چوک کے متصل لب سڑک واقع ہے، جہاں پر حکامان ضلع وفورس کافی تعداد میں ہمہ وقت موجود

رہتی تھی تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کے جنگلے کھڑکیاں نیز پانی سپلائی کی موٹر وپائپ وغیرہ سب نکال کر ٹرکوں پر لاد کر لے جائے گئے، آٹھ دس مسجدوں میں توڑ پھوڑ وکلام پاک جلانے کا کام کیا گیا ہے، مسجدیں زیادہ تر لب سڑک تھیں بہت سارے گھروں کو جلانے اور ان سب کے نصب شدہ دروازوں اور چھاجن کے ٹینوں کو اکھاڑ کر لے جایا گیا، تقریباً سات محلوں کے گھروں میں گھس گھس کر گھر کے اثاثے ونقدی پی اے سی وحکامان کے سامنے لوٹے گئے، اور گھر کے مرد، جوان، بچے، بوڑھے بلا امتیاز کے پکڑ کر کافی زدوکوب ومارپیٹ کر کے سنگین دفعات لگا کر چالان کر دیا گیا۔ اب ان لوگوں کی ضمانتیں ہو رہی ہیں، تقریباً ۵۰ - ۶۰ لوگوں کی ضمانتیں ہائی کورٹ سے ہوئی ہیں، اب الیکشن کی وجہ سے وہ بھی روک دی گئی ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ سلسلہ تقریباً ۴۷ سال سے جاری ہے اور اب اس میں شدت آگئی ہے، آئندہ ہوتی جائیگی، ناچیز کا خیال ہے کہ یہ عذاب ہم نام نہاد مسلمانوں پر ہماری دینی بے راہ روی کیوجہ سے خدا کی طرف سے ہے، لیکن افسوس کہ ہم کو مذکورہ باتوں پر ایمان ویقین نہیں ہے، سوائے شور وشر، چیخ وپکار کے اور کچھ نہیں سوجھتا، ہماری چیخ وپکار کو نہ خدا سنتا ہے نہ حکومت سنتی اور نہ ہم مسلمان اپنے صحیح مرض اور صحیح علاج کی طرف غور کرنے یا سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کا انجام ہماری بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ..... فقط

والسلام

نیاز مند

محمد مصطفی

خط نمبر ۲۴:

۲۰ / ۷ / ۱۹۸۹ء

جناب صدر صاحب، مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام، کانپور

جناب عالی! مولانا آزاد میموریل اکاڈمی کا قیام مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار اور کارناموں کی اشاعت اور انھیں ہندوستان کے مختلف طبقات میں بہتر تعلقات کے

فروغ دینے کے لئے عمل میں آیا ہے۔ اکیڈمی اس سال ماہ نومبر میں مولانا آزاد پر انگریزی، اردو اور ہندی میں مختلف مطبوعات کی خواہاں ہے۔
ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام نے مولانا آزاد کی معرکۃ الآرا تصنیف "ترجمان القرآن" کی جلد اول کا ہندی ترجمہ کرایا ہے۔ اس کی اشاعت مندرجہ بالا مقاصد کے علاوہ غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے میں بہت معاون ہوگی، چنانچہ ہماری خواہش ہے کہ اس ترجمہ کو اکیڈمی کو دیدیا جائے تاکہ وہ اس کی اشاعت کر سکے۔ اکیڈمی مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام کو اس کتاب کے ترجمہ پر خرچ کی گئی رقم کی ادائیگی شکریہ کے ساتھ کرنے کو تیار ہے۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلہ میں ہماری مدد کر کے شکریہ کا موقع فراہم کریں گے۔

آپ کا خیر اندیش

جلالی

جنرل سکریٹری

مولانا آزاد میموریل اکڈیمی، لکھنؤ

خط نمبر ۲۵:

۸ مارچ ۱۹۹۴ء

مکرم و محترم جناب محمد عبد السمیع ندوی ! سلام علیکم

گذارش ہے کہ آپ کا بھیجا ہوا "محکمات" رسالہ مجھ کو موصول ہوا، میں آپ کا بہت ممنون و مشکور ہوں، صرف شکایت اس امر کی ہے کہ چھاپنے میں کچھ غلطی ہوگئی ہے، شاید آپ نے غور نہیں کیا، میری بھیجی ہوئی "نعت شریف" ملاحظہ کریں تو غلطی محسوس ہوجائے گی۔ ..... اس کے علاوہ میں آپ کے پاس " منقبت خلیفہ سوئم عثمان غنی" بھیج رہا ہوں، ملاحظہ ہو اور اگر آپ چاہیں تو اس کو اپنے رسالہ "محکمات" میں شائع کریں نوازش ہوگی، اور میں آپ کا ممنون و مشکور ہونگا، فقط،، آپ کا فدوی

جے نرائن لال دیوانہ فتحپوری

خط نمبر ۲۶:

نندورا، ضلع بلڈانہ

۵ مئی ۱۹۹۰ء

محترم جناب محمد عبدالسمیع ندوی صاحب، السلام علیکم

..... ایک مشورہ طلب ہے، ایک غیر مسلم RSS (BJP) کا آدمی ہے وہ ہندی قرآن شریف پڑھنے کے لئے مانگ رہا ہے، کیا اس کو قران شریف دیا جائے یا قران شریف سمجھنے کے لئے کوئی دوسری ہندی کتاب دی جائے، اس کے متعلق اگر آپ کے پاس کوئی ہندی کتاب ہو تو مذکورہ کتابوں کے ساتھ روانہ کریں، والسلام، دعاء کی درخواست ہے۔ فقط والسلام

قاضی مبین الدین

خط نمبر ۲۷:

B. 94 / 14 جوشی کالونی، منڈولی،

فضل اللہ پور، دہلی - ۹۲

مکرمی ! سلام مسنون

عرض یہ ہے کہ آپ کے رسالہ "محکمات" کے دو شمارے موصول ہوئے۔ یہاں ہم روزنامہ "قومی آواز" میں نائب مدیر ہیں اس کے علاوہ ایک دوسرے روزنامہ " مشرقی آواز" دہلی، گونڈہ، گورکھپور، وعلی گڑھ کے دہلی دفتر میں بھی تھوڑی دیر کے لئے جاتا ہوں۔ مشرقی آواز کے دفتر میں آپ کا رسالہ آتا ہے اس سے بھرپور استفادہ کی کوشش کی جاتی ہے، اگست کے شمارے کے دو مضمون "غیر مسلم اکثریت" اور "قاری عبدالباسط" اندر کے صفحات میں شامل ہوکر تمام ایڈیشنوں میں شائع ہوچکے ہیں، ستمبر کے شمارہ سے بھی ایک آدھ مضمون لینا ہے۔

آپ کی مطبوعات بھی اپنے اور ہمسائیگان کے مطالعہ کے لئے منگانی ہیں مگر کوئی مناسب آدمی کانپور جانے والا نہیں مل رہا ہے ..... فقط والسلام

احمد اللہ فاروقی

نوٹ : خط پر تاریخ و سال موجود نہیں غالباً اکتوبر ۱۹۹۱ء کا خط ہے، نام میں بھی شبہ ہے کہ احمد اللہ فاروقی ہے یا رحمت اللہ فاروقی ہے۔

خط نمبر ۲۸:

مورخہ ۳ اگست ۱۹۸۹ء

محترم بھائی سمیع صاحب السلام علیکم

بعد خیریت کے واضح ہو کہ یہ خط میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں لکھ رہا ہوں آپ کے بہنوئی جناب زیدی صاحب اناو کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ عربی اور اردو وغیرہ میں کتابیں اور رسالے شائع کرتے ہیں اس سلسلے میں میرے ایک عزیز دوست ہیں وہ کافی دلچسپی رکھتے ہیں آپ برائے مہربانی ہندی میں جو قرآن اور دیگر دینی کتابوں کا ترجمہ کیا ہو ان کو بھیج دیں آپکی عین نوازش ہوگی۔ ہم لوگ ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ آئی۔ آئی۔ ٹی ایک تعلیمی ادارہ ہے اور بیرونی ممالک کے لوگ بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ اس خط کو ضروری سمجھیں اور اس کے ذریعہ تعلقات رکھیے، باقی سب خیریت ہے۔ خط کا منتظر

فقط خادم شمیم بیگ چغتائی

فلیٹ نمبر ۲۰۲۲ ٹائپ ۲، آئی۔ آئی۔ ٹی، کانپور

خط نمبر ۲۹:

انصاری لاج، لال ڈگی، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

۸/۱/۱۹۹۵ء

اخی العزیز! السلام علیکم

امید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ بخیر ہونگے "محکمات" ہر ماہ یادِ ماضی تازہ کرتا رہتا ہے
اور ۔ اللہ کرے روز قلم اور زیادہ
کی دعائیں لیتا رہتا ہے۔ جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے ذریعہ آپ جو دینی خدمت کر رہے ہیں اللہ پاک اسے قبول فرمائے اور اسلام کو چار دانگ عالم میں فروغ عطا کرے۔

میرے ایک غیر مسلم دوست کو اسلام پر لٹریچر مطلوب ہے اور بظاہر وہ اسلام کی طرف مائل معلوم ہوتے ہیں اس لئے آپ ان کے لئے ہندی میں جو جمعیۃ کی مطبوعات مناسب خیال کریں بھجوادیں اور جو قیمت آپ تحریر فرمائیں گے میں بھیج دوں گا مزید برآں اگر دیگر ناشرین کی اہم ہندی مطبوعات کی طرف رہنمائی کرسکیں تو مزید کرم ہو۔

اور ہاں مارچ - اپریل ۱۹۹۳ء کے محکمات میں آپ نے ۱۹۳۷ء تک جمعیۃ کی خدمات کا مختصر تعارف کرایا تھا اور دوسری قسط کا وعدہ کیا تھا پھر اس کی کب تک امید رکھوں ؟ اور ہاں اس مضمون میں " غبار افق " کا جو حوالہ ہے اس کا تعارف کراسکیں تو ممنون ہوںگا اور وہ کہاں مل سکے گا ؟ والسلام علیکم وعلی من لدیکم اخوکم

اقبال انصاری

خط نمبر ۳۰ :

۳۵ - چھوٹا بازار، فتح پور

۲۵ مارچ ۱۹۹۵ء

محترمی سمیع بھائی، سلام مسنون

عنایت نامہ ملا تھا ..... آپ کی صحت کیسی رہتی ہے ؟ بڑی بات ہے کہ پیرانہ سالی میں اب بھی آپ مشغلہ نوشت وخواند میں لگے ہیں ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، میں ۶۷ سال کی عمر میں ہمت ہار رہا ہوں۔

ادھر ایک کتاب مولانا نوید عثمانی کی " اب بھی نہ جاگے تو" پڑھ رہا ہوں، اہل ہنود کے سلسلہ میں خوب تحقیق و جستجو کی، اس کتاب نے ذہن کی بند راہیں کھولیں، کوڑا میں ایک صاحب سنسکرت سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں ان کو کتاب دکھائی، وید کے منتر اور قرآن حکیم کی سورتیں انھوں نے بھی دیکھیں جن سے ویدوں کا الہامی ہونا ثابت ہوتا ہے، پھر ہندوؤں میں جتنے باطل عقائد آئے ہیں ان کا بھی ذکر ہے، جیسے شرک، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے دوری، تناسخ کا باطل

عقیدہ وغیرہ، سچ ہے مولانا عثمانی صاحب نے غائر مطالعہ کرکے ہندوؤں کی گمراہی، حضرت نوح علیہ السلام کو فراموش کرنا، ان سارے حقائق کو سامنے لائے ہیں۔
اچھا اب اجازت دیجئے، بچوں کو دعائیں۔ والسلام
آپ کا ضیاء الدین احمد (حسنی)

خط نمبر ۳۱:

مدینہ منورہ

۳۰/۷/۱۴۱۶ھ

محترم مولانا عبدالسمیع صاحب دامت مجدھم ،، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ کا عنایت نامہ محررہ ۱۵ جمادی الثانیہ موصول ہوا، کتابوں میں دب گیا تھا نظروں سے اوجھل ہوگیا، جواب میں دیر لگی، آپ نے اپنی بیماری اور ضعف کا ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت قوت اور توانائی عطا فرمائے، اور خوب زیادہ تبلیغ الاسلام کا کام لے لے، آپ نے لکھا ہے کہ یونیورسٹی کے لوگ قبول اسلام کے لئے آجاتے ہیں، ہندوستان کے مختلف علاقوں سے خبریں آتی رہتی ہیں کہ ہندو مسلمان ہورہے ہیں، فرانس جرمنی انگلینڈ اور کینڈا سے بھی ایسی خبریں آرہی ہیں، میرے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی ہے کہ جیسے جیسے حضرت مہدی علیہ السلام کی تشریف آوری کا زمانہ قریب ہوتا جارہا ہے اسی قدر غیر مسلمین اسلام قبول کررہے ہیں، اقوام کو تو مسلمان ہونا ہی ہے لیکن ہماری اور آپ کی سعادت ہوگی کہ ہم اس کے لئے استعمال ہوجائیں .....۔ ہندو بابری مسجد کو شہید کرکے خوش تو ہوئے لیکن اس کے بعد سے جو ہندوؤں کے مسلسل مسلمان ہونے کا سلسلہ جاری ہوا ہے یہ ان کے لئے سوہان روح ہے، جس کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں۔ قلوب کو اللہ کے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا اور حق کو دبایا نہیں جاسکتا، آخر ہندوستان میں جو کروڑں مسلمان ہیں یہ ہندوؤں کی تو اولاد ہیں ..... مولانا مرتضیٰ صاحب کی وفات کا علم ہوا اللہ تعالیٰ شانہ ان کے درجات بلند فرمائے، موقعہ ہو تو علی میاں کو سلام پہنچے۔ والسلام ،، محمد عاشق الٰہی

خط نمبر ۳۲ :

۱۳/۱/۱۴۱۶ھ-

ص - ب - ۷۰۶، مدینۃ منورہ

محترم مولانا عبدالسمیع صاحب دامت برکاتھم ،، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہندی کا ایک رسالہ چند عدد وصول ہوا، جو ہریجنوں سے متعلق ہے، ماشاء اللہ ترجمہ بھی خوب ہے اور چھپائی بھی عمدہ ہے اور آپ کی ہمت اور حوصلہ کی بھی مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ ہندوستان میں لوگ ایسی چیزیں شائع کرنے سے بچتے ہیں، اب ایک مضمون اور لکھا ہے جو اسی قسم کا ہے، الفاظ اور ترتیب کا فرق ہے مضمون وہی ہے یہ بھی چھپ جائے تو بہتر ہے ...... ۔

احقر نے ایک خط لکھا تھا وہ ملا ہوگا، دعوت فکر اور حق کی پکار کے اردو ہندی انگریزی نسخے دس دس ارسال فرمادیں، مہربانی ہوگی۔

ہندوستان میں بیمے کی حلت وحرمت کا مسئلہ چل رہا ہے، اب دیوبند کا فتویٰ اس کی حرمت پر واضح طور پر آگیا، اس کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دارالافتاء کے رجسٹر مین نقل کروادیں، مولانا برہان الدین صاحب کو بھی ایک فوٹوکاپی دیدیں، ان کی خدمت میں سلام پیش فرمادیں، والسلام،،

محمد عاشق الٰہی

خط نمبر ۳۳ :

۲۵ مارچ ۱۹۹۵ء

محترم ومکرم مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ مجھے کئی روز قبل مل گیا تھا جس میں آپنی کتاب "قصبہ کوڑا تاریخ وشخصیات" ارسال کرنے کی آپ نے خبر دی تھی، بارے آج کی ڈاک سے وہ کتاب موصول ہوگئی، اس نوازش وکرم کا بہت بہت شکریہ، بطور وصولی اور شکریہ کے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

ان شاء اللہ پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد جواب میں کچھ عرض کروں گا،

مجھے خود قصبہ کوڑا جہان آباد کی تاریخ اور وہاں کی شخصیات کے حالات معلوم کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ الحمد للہ کہ آپ کی کوشش سے یہ کتاب مل گئی،

جزاکم اللہ خیرا الجزاء ...... والسلام

عون احمد قادری

پھلواری شریف، پٹنہ

خط نمبر ۳۴:

۴ صفر ۱۴۱۶ھ ۴ جولائی ۱۹۹۵ء

مخترمی زادت مودتکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

..... گراں قدر عطیہ وتحفہ ملا نہایت شکر گذار اور ممنون ہوں، جزاک اللہ تعالیٰ خیراً۔ "قصبہ کوڑا- تاریخ وشخصیات" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا بہت نفع ہوا، الحمد للہ تعالیٰ تذکرہ اسلاف صالحین میں بے شک رحمت کا نزول ہوتا ہے "تتنزل الرحمة عند ذکر الصالحين" اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے، اور اس سلسلہ میں بڑی کاوش وتدقیق کی ہے، "نسب نامہ صدیقی" کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے زحمت فرماکر مطلع کریں، ممنون ہوں گا۔

حضرت جد امجد ہادی ہند وبنگال مولانا شاہ کرامت علی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب "مفتاح الجنة" پر احقر ناکارہ کا حاشیہ "مصباح السنة مع مفتاح الجنة" پیش خدمت ہے۔ والسلام مع الاکرام

ظفر احمد صدیقی عفی عنہ

شبستان، ملا ٹولہ، جونپور

ایک عزیز رفیق اور اہم کارکن مولوی عبدالسمیع صاحب ندوی

مولوی سید مرتضی صاحب ناظر کتب خانہ علامہ شبلی کی وفات کا صدمہ ابھی بھولا نہیں تھا کہ اچانک ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کی رات میں مولوی سید محمد عبدالسمیع صاحب ندوی کی وفات کا حادثہ پیش آیا، عزیز مرحوم قصبہ کوڑہ جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ کے سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جہاں متعدد اعیان وشیوخ طریقت پیدا ہوئے مولانا وارث حسن صاحب جو ٹیلہ والی مسجد لکھنؤ کی مسند ارشاد واصلاح پر سالہا سال متمکن رہے، اور حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے رفیق سفر اور مالٹا میں رفیق حبس واسارت رہے اور وہیں انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوئے اسی تاریخی ومردم خیز قصبہ سے تعلق رکھتے تھے، مولوی عبدالسمیع صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند میں، عالمیت سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں تکمیل ادب کیا، وہ مولانا سید محمد عبدالحی صاحب کے صاحبزادہ تھے جو جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام اور اس کے بانی وروح رواں میر غلام بھیک نیرنگ صاحب مرحوم کے بڑے معتمد اور اس انجمن کے بڑے کارپرداز تھے جس کا مقصد اس وقت شدھی سنگھٹن کی تحریک ارتداد کا مقابلہ کرنا تھا جو آندھی اور طوفان کی طرح اٹھی تھی، وہ رسالہ "محکمات" کے بھی ایک عرصہ تک ایڈیٹر رہے، مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم "شعبہ تعمیر وترقی" ندوۃ العلماء کے نائب ناظر تھے اور نائب ناظم ندوۃ العلماء مولوی قاضی معین اللہ صاحب ندوی کے خاص معاونین ومعتمدین میں تھے، راقم سطور ان کی وفات سے چند ہی گھنٹے پہلے رابطہ کے اجلاس سالانہ میں شرکت کے لئے حجاز روانہ ہوگیا، ان کی روانگی کے بعد ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ماخوذ از: کاروانِ زندگی صفحہ ۲۱۱ جلد ششم)